تعلیم و تربیت
ماں کی لازوال محبت کی انوکھی کہانی
انوکھی خواہش
صفحہ نمبر 33
اپریل 2017
پڑھیے مزے مزے کی سبق آموز کہانیاں اور دیگر دلچسپ سلسلے

تعلیم وتربیت

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک شہزادہ اپنے استاد محترم سے سبق پڑھ رہا تھا۔ استاد محترم نے اسے دو جملے پڑھائے۔ پہلا سبق جھوٹ نہ بولو اور دوسرا سبق غصہ نہ کرو۔ استاد محترم نے کچھ دیر بعد شہزادے کو سبق سنانے کے لیے کہا۔ شہزادے نے کہا کہ ابھی سبق یاد نہیں ہوا۔ دوسرے دن استاد محترم نے پھر سبق سنانے کے کو کہا پھر شہزادے نے جواب دیا کہ استاد محترم ابھی سبق یاد نہیں ہو سکا۔ تیسرے دن چھٹی تھی۔ استاد محترم نے کہا کل چھٹی ہے لہٰذا سبق ضرور یاد کر لینا۔ بعد میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔

چھٹی کے اگلے دن بھی شاگردِ خاص ''سبق نہ سنا سکا۔'' استاد محترم نے یہ خیال کیے بغیر کہ شاگرد ایک شہزادہ ہے۔ غصے سے چلا اٹھے اور طیش میں آ کر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ استاد محترم نے فرمایا کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اتنے دنوں میں دو تین جملے یاد نہیں کر سکے۔ تھپڑ کھا کر شہزادہ پہلے تو گم سم ہو گیا اور پھر بولا: ''استاد محترم! سبق یاد ہو گیا ہے۔'' استاد کو بہت تعجب ہوا کہ پہلے تو سبق یاد نہیں ہو رہا تھا اب تھپڑ کھاتے ہی یک دم یاد ہو گیا۔ شہزادہ عرض کرنے لگا۔ ''استاد محترم آپ نے مجھے دو باتوں کا سبق دیا تھا۔ ایک جھوٹ نہ بولو، دوسرا غصہ نہ کرو۔ جھوٹ بولنے سے تو میں نے اسی دن توبہ کر لی تھی مگر غصہ نہ کرو یہ بہت مشکل کام تھا۔ بہت کوشش کرتا تھا غصہ نہ آئے مگر غصہ آ جاتا تھا۔ جب تک میں غصے پر قابو پانا سیکھ نہ جاتا کیسے کہہ دیتا کہ سبق یاد ہو گیا۔ آج جب آپ نے مجھے تھپڑ مارا اور یہ تھپڑ بھی میری زندگی کا پہلا تھپڑ ہے، اسی وقت میں نے اپنے دل و دماغ میں غور کیا کہ مجھے غصہ آیا کہ نہیں۔ غور کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ مجھے غصہ نہیں آیا۔ آج میں نے آپ کا بتایا ہوا دوسرا سبق ''غصہ نہ کرو'' بالکل سیکھ لیا ہے اور آج اللہ کے فضل و کرم سے مکمل سبق یاد ہو گیا ہے۔

پیارے اور عزیز بچو! ہم جو اقوال زریں پڑھتے اور سنتے ہیں ان پر عمل کرنا چاہیے۔ کیوں کہ بغیر عمل کے علم بے کار ہے۔ عمل ہی سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور عمل ہی سے زندگی بنتی ہے۔

ماہ اپریل کا رسالہ پڑھیے اور اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کریں۔ آپ کی آراء اور تجاویز ہمارے لیے بہت اہم ہیں اور ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے تاکہ رسالہ بہتر سے بہترین ہو اور آپ کے معیار پر اترتے ہوئے رسالے کے لوگو ''تعلیم و تربیت'' پر مکمل عمل بھی ہو۔ خوش رہیے۔ آپ سب کے لیے بہت سی دعائیں۔ اب اجازت دیجیے۔

فی امان اللہ

ایڈیٹر، پبلشر
ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر
عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ
محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم وتربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=1000 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ 35 روپے

حمد باری تعالیٰ

ہو کرم کی اک نظر ہم پر خدائے لم یزل
ہم سیاہ کاروں میں ہیں ہم کو بنا دے باعمل
سب سے بڑھ کر حسیںن اور حسن کا شیدائی ہے
اپنی قدرت کاملہ ہر ایک سے منوائی ہے
خالق و مالک ہے سب کا اے خدائے ذوالجلال
تو وہ ہستی ہے نہیں جس کی کوئی مثل و مثال
ساری مخلوقات کی چارہ گری کرتا ہے تو
جسمِ انساں پر لگے ہر گھاؤ کو بھرتا ہے تو
تو ہے واحد تو ہے یکتا دوسرا کوئی نہیں
ہر جگہ موجود ہے تو بالیقین و بالیقین
تو گل و گلزار میں ہے ریگ زاروں میں ہے تو
اونچے اونچے پربتوں میں ، کوہساروں میں ہے تو
تو قمر کی سوچ کا محور ہے بے شک و شبہ
تیری قدرت کے ترانے لکھتا ہے صبح و مسا

نعت رسولِ مقبول ﷺ

دل میں تڑپ ہے آپؐ کے روضے پہ جاؤں میں
خاکِ مدینہ پاک کو سرمہ بناؤں میں
ڈوبا ہوا ہوں بحرِ غمِ روزگار — میں
پہنچوں درِ حبیبؐ پر اور مسکراؤں میں
مجھ کو قبول کر لیں غلامی میں — گر حضورؐ
اس بات پر ہی عمر بھر خوشیاں مناؤں میں
آ جائے مجھ پہ ترس رسالت مآبؐ — کو
جا کر درِ رسولؐ پر یوں گڑگڑاؤں میں
ہوتے ہیں جب بھی قافلے حج کے لیے رواں
کتنی ہی مشکلوں سے غمِ دل چھپاؤں میں
ہوتا ہوں اطمینان کی دولت سے مالا مال
نعتِ رسولؐ پاک جب بھی گنگناؤں میں
وہ شافعِ روزِ جزا ہیں بالیقیں — قمر
اپنے گناہ کس لیے انؐ سے چھپاؤں — میں

ریاض حسین قمؔر

لم یزل: ہمیشہ رہنے والا
مسا: شام
ریگ زار: ریگستان
پربت: پہاڑ

سفرِ معراج

محمد طیب الیاس

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تا کہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔'' (سورۂ بنی اسرائیل، آیت: 1)

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر وہاں سے آسمانوں تک کا سفر کرایا۔ آپؐ کا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر ''اسراء'' اور مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر جانے کا سفر ''معراج'' کہلاتا ہے۔ یہ سارا سفر ایک ہی رات میں ہوا۔ اس سفر میں انبیاء کرامؑ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ آپؐ کو انبیاء کرامؑ کی امامت کا شرف بخشا گیا۔ نماز کا تحفہ عطا کیا گیا۔ مشرک کے علاوہ سب کے لیے معافی کا پروانہ ملا۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیات بھی خاص طور سے عطا کی گئیں جو بہت برکات کی حامل ہیں۔ آپ ﷺ رب تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ اس کے علاوہ سفرِ معراج میں آپ ﷺ کو چند نشانیاں یعنی عجائب قدرت دکھائی گئیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے چہروں اور سینوں کو چھیل رہے تھے، میں نے کہا: ''اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے گوشت کھاتے ہیں (یعنی غیبت کرتے ہیں) اور ان کی بے آبروئی کرنے میں پڑے رہتے ہیں۔'' (ابوداؤد، کتاب الادب: 4878)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس رات مجھے (آسمانوں کی) سیر کرائی گئی، میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے (جیسے انسانوں کے رہنے کے) گھر ہوتے ہیں، ان میں سانپ تھے جو باہر سے ان کے پیٹوں میں نظر آرہے تھے، میں نے کہا: ''اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سود کھانے والے ہیں۔'' (ابن ماجہ، کتاب التجارات: 2273)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اس درمیان کہ میں جنت میں چلا جا رہا تھا، اچانک دیکھتا ہوں کہ میں ایک ایسی نہر پر ہوں جس کے دونوں کناروں پر ایسے موتیوں کے قبے ہیں جو اندر سے خالی ہیں (یعنی موتی نما گھر دیکھے)، میں نے کہا: ''اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہر کوثر ہے، جو آپ کو آپ کے رب نے عطا فرمائی ہے، میں نے جو دھیان کیا تو دیکھتا ہوں اس کی مٹی (جس کی سطح پر پانی بہہ رہا ہے) خوب تیز خوشبو والی مشک ہے۔''

(بخاری، کتاب الرقاق: 6581)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''(آسمانوں کی سیر کے دوران) بیت المعمور میرے سامنے کر دیا گیا، میں نے جبرئیل سے سوال کیا: ''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ یہ بیت المعمور ہے، اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، جب وہ نکل کر چلے جاتے ہیں تو پھر کبھی بھی واپس نہیں ہوتے۔'' (مسلم، کتاب الایمان: 164)

مذکورہ روایات اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج میں نبی پاک ﷺ نے آنکھوں سے خود مشاہدہ فرمایا کہ سود خور سانپ کھا رہا ہے، بدکار مرد و عورت بدبودار مردار گوشت کھا رہے ہیں، بے نمازی کا سر کچلا جا رہا ہے، جھوٹ بولنے والے خطباء کی زبانیں کتری جا رہی ہیں، یتیموں کا مال کھانے والوں کے پیٹ میں انگارے بھرے ہوئے ہیں۔ اس طرح بہت سے گناہوں پر سزاؤں کا ملنا آپؐ نے خود مشاہدہ فرمایا۔ آپؐ نے جنت اور جہنم کو بھی دیکھا۔ (بقیہ صفحہ نمبر 46)

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ملک تیونس میں قالینوں کا کوئی سوداگر رہتا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اس نے دوسری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ سوتیلی ماں نا معلوم بچیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔

سوداگر اپنی بچیوں کے ساتھ ایک بہت بڑی حویلی میں رہتا تھا۔ ان کا ایک اور ساتھی بھی تھا، اور وہ تھا ایک کتا جس کا نام زنادہ تھا۔

زنادہ سب سے چھوٹی بہن عائشہ کا لاڈلا تھا۔ اسی نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ عائشہ اس کو کھلاتی پلاتی، نہلاتی دھلاتی اور اس کے ساتھ کھیلتی۔ وہ زنادہ سے اس طرح باتیں کرتی جیسے وہ انسان ہو۔

زنادہ اصل میں کتا نہیں، جن تھا اور جن بھی خوش مزاج اور انسانوں سے محبت کرنے والا۔ بس دل بہلانے کے لیے وہ کتے کی شکل میں سوداگر کے گھر رہنے لگا تھا۔

سوداگر ہر روز صبح سویرے بازار جا کر اپنی دُکان کھولتا، قالین باہر نکالتا اور سجا کر رکھ دیتا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے کھانا کھانے گھر آتا اور پھر دُکان پر چلا جاتا اور شام تک مصروف رہتا۔ اس کی زندگی اسی طریقے سے گزر رہی تھی۔

ایک روز دُکان سے واپسی پر وہ مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ ایک ڈھنڈورچی کی آواز سنائی دی:

''اے مسلمانو! خدا کو یاد کرو۔ صرف وہی بھروسے کے قابل ہے۔ اے گناہ گارو! خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ اسی کی تعریف کرو۔ یاد رکھو، حج کرنا ہر مال دار مسلمان پر فرض ہے۔ آپ میں سے جو بھی خدا کا گھر دیکھنا چاہتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے روضے کی زیارت کرنا چاہتا ہے، اس کو اطلاع دی جاتی ہے کہ حاجیوں کا قافلہ مکے سفر پر اس مہینے کی پانچ تاریخ کو روانہ ہوگا۔''

سوداگر نے یہ منادی سنی تو اس کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ وہ بھی حج کے لیے جائے۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اس سال مکے ضرور جائے گا اور خدا کے گھر میں حاضری دے گا۔ وہ جلدی جلدی گھر پہنچا اور بیٹیوں سے کہا:

''میری پیاری بیٹیو، تم دیکھ رہی ہو کہ میرے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن میں نے ابھی تک حج کا فرض ادا نہیں کیا اور نہ رسولِ مقبول حضرت محمد ﷺ کا روضۂ مبارک دیکھا ہے۔ اس سال میں یہ فرض ضرور پورا کروں گا لیکن میری بچیو! اگر میں حج کرنے گیا تو

مجھے تمہاری فکر لگی رہے گی۔ میرے پیچھے تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟''

یہ سن کر اس کی بیٹیاں اداس ہونے کے بجائے خوش ہوئیں اور بڑی لڑکی کہنے لگی:

''ابا جان، آپ ضرور تشریف لے جائیں اور ہماری فکر نہ کریں۔''

''زنادہ ہماری حفاظت کرے گا۔'' عائشہ نے بھی باپ کو تسلی دی۔

لڑکیوں نے خوشی خوشی باپ کا سامان باندھ دیا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں پکا کر ساتھ کر دیں۔ کچھ چیزیں کچی بھی باندھ دیں تاکہ باپ کو لمبے سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اس زمانے میں تیونس سے مکے جانے اور واپس آنے میں ایک سال لگ جاتا تھا۔

سوداگر نے بیٹیوں کے لیے سال بھر کا کھانے پینے کا سامان گھر میں ڈال دیا۔ ضرورت کی ہر چیز خرید کر دے دی تاکہ لڑکیوں کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ پھر اس نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے کہا:

''گھر سے باہر قدم نہ رکھنا۔ کوئی بھی آئے، دروازہ ہرگز نہ کھولنا۔''

''جب تک آپ نہیں آئیں گے، ہم دروازہ نہیں کھولیں گے۔'' لڑکیوں نے وعدہ کیا۔

سوداگر نے بیٹیوں کو گلے لگا کر پیار کیا اور پھر انہیں خدا کے حوالے کر کے حج پر روانہ ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ زنادہ کی موجودگی میں کوئی بھی گھر کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

لڑکیوں نے دروازے کو اچھی طرح بند کر لیا اور حویلی میں آرام سے رہنے لگیں۔ زنادہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ سارا دن صحن میں کھیلتا اور رات کو عائشہ کی پائینتی سو جاتا۔

کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک دن دروازے پر زور زور سے تین بار دستک ہوئی۔ پھر ایک عورت کی آواز آئی:

''دروازہ کھولو!''

ساتوں بہنیں دروازے کے پاس جمع ہو گئیں اور پوچھا:

''کون ہیں آپ؟''

باہر کھڑی عورت بڑی نرمی سے بولی: ''پیاری بھانجیو، میں تمہاری خالہ ہوں۔ تمہاری امی کی سگی بہن۔''

عائشہ نے فوراً کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، بڑی بی۔ ہماری تو کوئی خالہ نہیں۔ ہماری امی جان ہمارے ابا جان کی طرح اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس لیے ہماری نہ تو کوئی خالہ ہے نہ ماموں۔ ابا جان کے سوا ہمارا کوئی رشتے دار نہیں۔ البتہ خدا ہے، جو سب کا ہے۔''

''احمق لڑکی!'' عورت نے باہر سے جواب دیا۔ ''تم تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں جب میری شادی ہوئی اور میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر پردیس چلی گئی بڑی پیاری بچیاں ہو تم تو۔ شاباش! دروازہ کھولو۔ دیکھو، میں بہت تھک گئی ہوں اور باہر دھوپ اتنی تیز ہے کہ بھیجا پگھلا جا رہا ہے۔ کوئی سایہ بھی نہیں کہ اس کے نیچے کھڑی ہو جاؤں۔ بڑی اچھی ہو تم۔ جلدی سے کھولو۔ تھوڑی دیر آرام کر کے تمہیں مزے مزے کی کہانیاں سناؤں گی۔ دوسرے ملکوں کے بارے میں بتاؤں گی۔ تمہاری امی اور نانی کے بارے میں بتاؤں گی۔''

بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مشورہ کرنے لگیں۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' عائشہ نے کہا۔ ''خدا کے واسطے دروازہ نہ کھولنا۔ مجھے یقین ہے یہ عورت ہماری خالہ نہیں۔ اگر یہ سچ مچ ہماری خالہ ہے تو بھی ہمیں دروازہ نہیں کھولنا چاہیے، کیوں کہ ابا جان نے سختی سے منع کیا تھا اور آپ یہ بھی جانتی ہیں جو اپنے ماں باپ کا کہا نہیں مانتے بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔''

زنادہ پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ ایک دم بھونکنے لگا۔ ''بھوں، بھوں یعنی میں زنادہ ہوں، آپ سب کا رکھوالا ہوں۔ جو کوئی بھی آپ کو نقصان پہنچائے گا، میں اس کی بوٹیاں کر دوں گا۔''

کتے کی آواز سن کر نقلی خالہ وہاں سے کھسکتے ہوئے بولی:

''پھو! کتنی گندی بو آ رہی ہے اس کتے سے۔''

زنادہ جن تھا اس لیے وہ بڑھیا کی آواز سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اصل میں وہ چڑیل تھی زنادہ کو معلوم تھا کہ وہ بچیوں کو کھانے کے لیے آئی ہے اور چڑیل بھی یہ جانتی تھی کہ جب تک یہ جن بچیوں کی نگرانی کر رہا ہے وہ ان کو نہیں کھا سکتی کیوں کہ جن بھوتوں اور چڑیلوں کے جانی دشمن ہوتے ہیں۔

ساری رات چڑیل گھر کے اردگرد منڈلاتی رہی۔ رات کے وقت وہ اپنی اصل شکل میں گھوم رہی تھی۔ یہ لمبے لمبے تیز دانت، بال ایسے جیسے سانپ کنڈلی مارے بیٹھے ہوں۔ وہ زور زور سے چیخ

رہی تھی:

''اس گھر میں سات چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں۔ کل میں ان سب کو چٹ کر جاؤں گی۔''

کتا ساری رات بھونکتا رہا۔ ''بھوؤں بھوں'' میں بھی زنادہ ہوں۔ ان بچیوں کا رکھوالا۔ تو ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔''

اگلے روز چڑیل پھر عورت کے بھیس میں آئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر بولی:

''پیاری بھانجیو، دروازہ کھولو۔ میں تمہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کروں گی۔ میری مری ہوئی بہن کی نشانی ہو تم۔ دیکھو میں تمہارے لیے دیس دیس کے تحفے لائی ہوں۔''

جب چڑیل نے یہ کہا تو باقی چھ بہنیں دروازہ کھولنے کے لیے دوڑیں۔

''نہ نہ'' عائشہ نے چیخ کر کہا۔ ''ہم نے ابا سے وعدہ کیا تھا کہ اس وقت تک دروازہ نہیں کھولیں گے جب تک وہ خود نہ آئیں۔ اور پھر ہمارا کتا زنادہ ساری رات بھونکتا رہا ہے۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ دروازہ مت کھولنا۔ یہ عورت چڑیل ہے۔''

عائشہ نے اپنی بہنوں کو بہت منع کیا، ان کو بہت روکا لیکن بہنوں نے غصے سے اسے پرے دھکیل دیا اور برا بھلا کہنے لگیں۔

''تم تو بے وقوف ہو۔ تم اور تمہارا کتا دونوں۔ ہماری خالہ آئی ہیں اور ہم دروازہ نہ کھولیں۔ واہ! فرض کرو وہ سچ مچ خالہ نہیں ہے تو کیا فرق پڑے گا۔ ایسی نرم دل بڑھیا ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ وہ ہمارے لیے تحفے لے کر آئی ہے۔ وہ ہمیں مزے مزے کی کہانیاں سنائے گی۔''

عائشہ پھر بھی نہ مانی اور بہنوں کا راستہ روک کر بولی ''نہ نہ۔ میں نہیں کھولنے دوں گی۔''

لیکن بہنوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور دو تین تھپڑ جڑ کر اسے پرے ہٹا دیا۔ پھر دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔

''خالہ جان، تشریف لایئے۔''

مگر راستے میں زنادہ کھڑا تھا اور غصے کے مارے زور زور سے بھونک رہا تھا۔ چڑیل اس کے ڈر سے آگے نہ بڑھی اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ پھیلا کر بولی:

''چھو چھو۔ بیٹی، اس کتے کی بدبو سے تو دماغ اڑا جاتا ہے۔ جب تک اس کو جان سے نہیں مار دو گی، میں اندر نہیں آؤں گی۔''

بڑی بہنوں نے اسی وقت کتے کو پکڑا اور گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ عائشہ بے چاری بہت روئی، بہت چلائی، بہتیرا منع کیا مگر بہنوں نے ایک نہ سنی۔ وہ چھ ایک طرف اور عائشہ اکیلی ایک طرف۔ وہ غریب کیا کر سکتی تھی۔ عائشہ کو کتے کے پاس روتا ہوا چھوڑ کر باقی بہنوں نے بڑھیا کو اندر بلا لیا۔

جوں ہی چڑیل نے دروازے کے اندر پاؤں رکھا، مردہ کتے کی لاش بھونکنے لگی۔ بڑھیا پھر پیچھے ہٹ گئی۔

''توبہ! توبہ! مرے ہوئے کتے میں سے تو اور بھی بری بو آرہی ہے۔ میں تو اندر نہیں آؤں گی۔ پہلے اس کو جلا دو۔''

بڑی بہنوں نے فوراً کتے کی لاش کو جلا دیا۔ عائشہ انہیں نہ روک سکی۔ لیکن جب آگ اچھی طرح بجھ گئی تو اس نے کتے کی راکھ کو سمیٹ کر رومال میں باندھی اور اپنے پاس رکھ لی۔ پھر الگ بیٹھ کر اپنے پیارے کتے کو یاد کر کے رونے لگی۔ بہنوں نے بڑھیا کے لیے اچھے اچھے کھانے تیار کیے اور اس سے مزے مزے کی باتیں سنتی رہیں۔

دن کے وقت تو بڑھیا لڑکیوں کے ساتھ ہنستی بولتی رہی، جیسے سچ مچ کی خالہ ہو۔ اس نے لڑکیوں کو تحفے بھی دیے۔ لیکن جب رات ہوئی تو وہ اپنی اصل شکل میں آگئی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ چھروں کی طرح تیز اور لمبے دانت نکل آئے۔ بال سانپوں کی مانند پھنکارنے لگے۔ ہاتھ تیز ناخنوں والے پنجے بن گئے۔ وہ بے چین ہو کر ادھر اُدھر گھومنے لگی اور چیخنے چلانے لگی:

''اس گھر میں سات بہنیں ہیں۔ میں آج ان سب کو کھا جاؤں گی۔''

عائشہ کو بڑھیا پر پہلے ہی شک تھا۔ وہ جلدی سے چارپائی کے نیچے چھپ گئی۔ باقی چھ بہنوں کو خبر ہی نہ ہوئی۔ چڑیل نے ان سب کو پکڑ لیا۔ سب سے پہلے اس نے بڑی بہن سے پوچھا:

''میرے نرم نرم چوزے، بول تجھے کہاں سے کھانا شروع کروں؟''

''میرے سر سے کھانا شروع کرو کیوں کہ اس احمق نے عائشہ کی بات نہ سمجھی۔'' بڑی بہن نے جواب دیا۔

بڑھیا نے مزے لے لے کر بڑی بہن کو کھایا۔ پھر اس سے چھوٹی کے پاس گئی اور بولی:

"میرے نرم نرم چوزے، بول۔
تجھے کہاں سے کھانا شروع کروں؟"

"پہلے میرے احمق ہاتھوں کو کھاؤ کیوں کہ ان سے میں نے عائشہ کو مارا تھا۔" دوسری بہن نے جواب دیا۔

چڑیل اس کے ہاتھوں کی ہڈیاں چبانے لگی۔ جب ساری لڑکی اس کے پیٹ میں چلی گئی اور اس نے تیسری لڑکی سے وہی سوال کیا۔ لڑکی نے جواب دیا:

"پہلے میرے کان کھاؤ کیوں کہ انہوں نے عائشہ کی ایک نہ سنی۔"

چڑیل نے تیسری بہن کو بھی نگل لیا۔ جب اس نے چوتھی بہن سے پوچھا تو اس نے کہا:

"پہلے میری ٹانگیں کھاؤ کیوں کہ ان بے وقوفوں نے عائشہ کو مارا تھا۔"

چڑیل نے اسے بھی ہڑپ کر لیا۔ پانچویں بہن نے کہا:

"پہلے میرا منہ کھاؤ۔ جب عائشہ مجھے دروازہ کھولنے سے روک رہی تھی تو یہ اسے برا بھلا کہہ رہا تھا۔"

چڑیل نے اسے بھی چٹ کر لیا۔ اب اس نے چھٹی بہن سے پوچھا تو وہ بولی:

"پہلے میری آنکھیں کھاؤ۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ عائشہ دروازہ کھولنے سے کیوں منع کر رہی ہے۔" چڑیل اس کو بھی ہڑپ کر گئی۔

اب وہ ساتویں بہن کی تلاش میں کونے کھدرے دیکھنے لگی۔ ہر کمرے میں گئی۔ صحن میں ڈھونڈا۔ آخر اس کو معلوم ہو گیا کہ عائشہ چارپائی کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ وہ کڑک کر بولی:

"مجھ سے بچ کر کہاں جائے گی۔ بول، پہلے کہاں سے کھاؤں؟"

عائشہ منہ سے ایک لفظ نہ بولی۔ اس نے چپکے سے وہ پوٹلی نکالی جس میں زنادہ کی راکھ بندھی ہوئی تھی۔ اس نے پوٹلی چڑیل کے منہ پر دے ماری۔ ایسا لگتا تھا جیسے راکھ کا ہر ذرہ زنادہ بن گیا ہے اور بھونک بھونک کر کہہ رہا ہے:

"بھوں، بھوں۔ میں زنادہ ہوں۔ ان لڑکیوں کا رکھوالا۔ جو کوئی انہیں نقصان پہنچائے گا میں اس کی بوٹیاں نوچ لوں گا۔"

چڑیل ڈر کے مارے دروازے کی طرف بھاگی۔ وہ چیخ رہی تھی:

"مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ یہ کتا مجھے مار ڈالے گا۔"

لیکن کتے کی راکھ بھونکے جا رہی تھی:

"میں زنادہ ہوں۔ میں زنادہ ہوں۔" ان آوازوں نے چڑیل کے جسم میں آگ لگا دی اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

عائشہ چارپائی کے نیچے سے نکل آئی اور گھر کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر یہ تالا اس نے اس دن کھولا جب اس کے ابا حج سے واپس آئے۔

☆☆☆

دُودھ کے دانت

احمد عدنان طارق

کیا آپ کے گھر کبھی کوئی پَری دودھ کے دانت لینے آئی ہے؟ ہو سکتا ہے آپ ابھی اتنے چھوٹے ہوں کہ آپ کے دودھ کے دانت ٹوٹے ہی نہ ہوں؟ جب آپ کے دودھ کے دانت ٹوٹیں تو آپ اپنا پُرانا دانت سنبھال کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیں۔ جب رات کو آپ گہری نیند سو جائیں گے تو ایک پیاری سی پَری آ کر آپ کا ٹوٹا ہوا دانت لے جائے گی اور اس کے بدلے آپ کے تکیے کے نیچے کوئی خوب صورت سا تحفہ رکھ جائے گی۔

ٹوٹے دانت اکٹھے کرنا بہت مشکل کام ہے۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ دودھ کے دانت اکٹھے کرنے والی پَری ہمیشہ مصروف ہی رہتی ہے۔ دُنیا میں بے شمار بچے ہیں جو بڑے ہو رہے ہیں اور ان کے دودھ کے دانت بھی ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اب بے چاری اکیلی پَری جس کا نام ثمرین ہے، اسے ان تمام ٹوٹے ہوئے دانتوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور یہ کام وہ صرف رات کو ہی کر سکتی ہے کیوں کہ اس وقت سبھی بچے سوئے ہوتے ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ دُنیا کے ایک حصے میں اگر رات ہوتی ہے تو دوسرے حصے میں دن، اس لیے ایک وقت میں ثمرین پَری کو آدھی دُنیا کا خیال رکھنا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے ساری رات لاکھوں ٹوٹے ہوئے دودھ کے دانت اکٹھے کرنے پڑتے ہیں۔

ثمرین پَری بھی اتنی ہی ننھی منی سی ہے، جتنی دُنیا میں کام کرنے والی دوسری پَریاں۔ کسی بچے کے سامنے کا دانت اُٹھانا آسان ہے جب کہ اگر پچھلا کوئی دانت ٹوٹے تو وہ خاصا بھاری ہوتا ہے۔ اس لیے کئی دفعہ ان ٹوٹے ہوئے دانتوں کو پرستان تک لے کر جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ثمرین کو پچھلے سال سردیوں میں ایک ہفتہ مسلسل بہت کام کرنا پڑا، لہٰذا وہ بہت زیادہ تھک گئی۔ وہ سیدھا اماں فطرت کے پاس پہنچی اور اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ وہ بولی:

''اماں جی! مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ پتا نہیں دُنیا میں بچے پہلے سے جلدی جلدی بڑے ہو رہے ہیں؟ مجھے یوں لگنے لگا ہے کہ ان کے دانت پہلے سے بھاری ہو گئے ہیں، انہیں اُٹھا کر

پرستان لاتے ہوئے بہت مشکل ہو رہی ہے۔ سارا دن دُنیا کی ایک طرف کام کر کر کے مجھے رات کو دُنیا کی دوسری طرف بھی جانا پڑتا ہے۔ اس لیے اب تو میں سو بھی نہیں سکتی۔ دودھ کے دانت اُٹھاتے اُٹھاتے میں بہت تھک گئی ہوں۔ میرا تو دم ہی نکل گیا ہے۔''

اماں فکر مند ہو کر بولی: ''پیاری ثمرین یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا ہے لیکن اب مجھے سوچنے دو۔ میں اس بارے میں کل تم سے بات کروں گی۔ کل تم اسی وقت میرے پاس آنا، پھر فیصلہ کریں گے کہ اس مسئلے کو کیسے حل کرنا ہے؟'' ثمرین اماں کا شکریہ ادا کر کے بولی: ''میں کل آؤں گی۔'' اس کے جانے کے بعد اماں فطرت بہت دیر تک اس مشکل کے بارے میں سوچتی رہی لیکن اسے اس مشکل کا حل سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ثمرین کی مدد کے لیے اور پَریوں کی نوکری بھی لگا دیتی ہے تو پھر بھی یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے یہ کام آتا ہو۔ ہر کوئی تو یہ کام نہیں کر سکتا اور دانتوں کے بھاری ہونے کا حل تو اماں فطرت کے پاس بھی نہیں تھا۔

آخر بڑی سوچ بچار کرنے سے اماں بھی تھک گئی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ تھوڑی چہل قدمی کر لے۔ اس سے اسے تھوڑی راحت ملے گی۔ موسم بہت ہی اچھا ہو رہا تھا۔ عمر رسیدہ اماں ایک ندی کے کنارے کنارے چہل قدمی کرتی رہی۔ ندی کے اردگرد سرسبز چراہ گاہیں تھیں جن میں خوشنما پھول اُگے ہوئے تھے۔ سورج کی تمازت سے بچنے کے لیے درخت چھاؤں بکھیرے کھڑے تھے۔ موسم بہت حسین تھا۔ اماں نے سوچا کہ وہ ندی کے کنارے چند لمحے آرام کر لے لیکن جیسے ہی وہ نرم نرم گھاس پر بیٹھی، نیند نے اسے آلیا اور وہ سو گئی۔

اماں فطرت کو بھی کم و بیش اتنا ہی کام کرنا پڑتا تھا جتنا ثمرین پَری کو لہٰذا یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی۔ اگرچہ وہ دوپہر کو وہیں سو گئی تھی لیکن زیادہ دیر تک سو نہیں سکی کیوں کہ جیسے ہی وہ نیند کی آغوش میں گئی، اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کی ناک میں خارش کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور چھینکیں مارنے لگی۔ ''آچھو...... آچھو'' دوبارہ اس کی ناک میں خارش ہونے لگی۔ اس نے اوپر دیکھا تو اس نے بے شمار گکروندے کے بیجوں کو اپنی روئی سمیت ہوا میں اڑتے دیکھا۔ گکروندے کو ہم عام طور پر سنبل بھی کہتے ہیں اور اس کے بیجوں کے ساتھ جو روئی ہوتی ہے، اسے ہم اکٹھا کر کے تکیوں میں بھی ڈالتے ہیں۔ یہ نرم تکیے بچوں کو بہت پسند ہیں۔

یہی وہ بیج تھے جو اماں کی ناک میں بار بار خارش کر رہے تھے۔ اماں نے جب ان ننھے ننھے پیراشوٹوں کو فضا میں تیرتے ہوئے دیکھا تو اسے فوراً ایک زبردست ترکیب سوجھی۔ اگلے دن جب ثمرین پَری اماں فطرت کو دوبارہ ملنے آئی تو اماں بی کام میں مشغول تھی۔ وہ بڑی سنجیدگی سے گکروندے کی پَریوں سے محو گفتگو تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: ''پیاری پَریو! تمہیں سمجھ آ گئی ہے ناں کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ یہ مسئلہ صرف ایک دوسرے سے تعاون کا ہے۔ تم جب تک آپس میں اور ثمرین سے مشورہ کرتی رہو گی تو ہمیں چیزیں اوپر لے جانے یا نیچے لے آنے میں کبھی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بتاؤ! مسئلہ ہو گا؟''

سنبل کی پَریوں نے جواب دیا: ''اماں! کبھی نہیں ہو گا۔'' انھوں نے اپنے جھالروں والے پیلے رنگ کے لباس بھی جھاڑے جن پر سنبل کی روئی چمٹی جا رہی تھی۔ ثمرین کے اماں کے پاس پہنچنے سے پہلے سنبل کی پَریوں کو سمجھا چکی تھی کہ وہ جب کوئی بڑا دودھ کا دانت ٹوٹا ہوا دیکھیں یا ثمرین انہیں مدد کے لیے بلائے تو اس دانت کے ساتھ کئی سنبل کے بیج جوڑ دو جو اسے بآسانی لے کر ہوا میں بلند ہو سکتے ہیں اور آرام سے دُنیا سے پرستان بھیجے جا سکتے ہیں۔ ثمرین تو خوشی سے جھوم اُٹھی اور بولی: ''اماں! یہ تو بہت ہی اچھی ترکیب ہے۔ تم بہت سیانی ہو۔''

اماں فطرت بے اختیار بولی: ''نہیں بیٹا! صرف قدرت سب سے طاقت ور ہے۔ میں تو صرف اپنی استطاعت کے مطابق دوسروں کی مدد کر دیتی ہوں۔''

اب بچو! غور سے سنو! جس رات آپ کا دودھ کا دانت ٹوٹ جائے اور آپ کو چھینک بھی آئے تو آپ کو پتا چل جانا چاہیے کہ کیا ہو رہا ہے۔ سمجھ لو کہ رنگ برنگ جھالروں والی پَریاں ٹوٹے دانتوں کے ساتھ سنبل کے بیج جوڑ رہی ہیں اور آپ کے تکیے کے نیچے ایک خوب صورت سا تحفہ پڑا ہے۔ ذرا تکیہ اُٹھا کر دیکھیے تو سہی......!!!

☆☆☆

جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل
مسافر شب سے اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے
(ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
(محمد حمزہ لغاری، میاں والی)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(مریم منیر، چونیاں)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
(شہزاد حسین، وہاڑی)

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

☆

وہ جو آتے تھے منصب جاگیر کے ساتھ
اب کیسے چپ کھڑے ہیں تیری تصویر کے ساتھ
آج سورج کی روانی میں دیر ہوئی
ورنہ میں نکلتا نہیں تاخیر کے ساتھ

☆

تیرے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ تماشا، نظر کی بات نہ کر

☆

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب ہے جہاں، نہ قفس نہ آشیانہ
(حافظ خنساء اقبال، جہانیاں)

اندھیری رات کو یہ معجزہ دکھائیں گے ہم
چراغ اگر نہ ملا، اپنا دل جلائیں گے ہم
ہماری کوہ کنی کے ہیں مختلف معیار
پہاڑ کاٹ کے رستے نئے بنائیں گے ہم
جو دل دکھا ہے تو یہ عزم بھی ملا ہے ہمیں
تمام عمر کسی کا نہ دل دکھائیں گے ہم
(انور کامران، لاہور)

یہی ہے عبادت، یہی ہے دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
(حافظ آمنہ اسلم، جہانیاں)

اس دور کی دنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے
یہ لوگ بھی کیا ہیں مر کیوں نہیں جاتے
آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات سنور کیوں نہیں جاتے
(کاظمہ زہرہ، لاہور)

دعا تو دل سے مانگی جاتی ہے، زبان سے نہیں اقبال
قبول تو اس کی بھی ہوتی ہے، جس کی زبان نہیں ہوتی
(شائلہ ناز، میاں والی)

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں
(محمد کاشف جاوید، وہاڑی)

کہاں قاتل بدلتے ہیں فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں
وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں
(محمد احمد، لاہور)

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
(واصف علی، پشاور)

پیارے اللہ کے پیارے نام

راشد علی نواب شاہی

اَلْجَلِیْلُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بڑے اور بلند رتبے والا)

اَلْجَلِیْلُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو بڑی قدرت والا اور بلند شان والا ہے۔ اللہ رب العزت کی قدرت اور بڑائی کے آگے ہر بڑائی والا چھوٹا اور بلند شان والا حقیر ہے۔

اس ساری کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ آسمان، کھربوں ستارے، سیارے، یہ زمین سے لاکھوں گنا بڑا سورج، چاند، زمین، پانی، سمندر، ہوائیں، یہ بلند وبالا پہاڑ، ندیاں لوہا، تانبا، پیتل، جنگلات، چرند، پرند، انسان، جنات، کیڑے مکوڑے اور یہ کروڑوں مچھلیاں، ان سب کو کائنات کہتے ہیں۔ جب یہ کائنات اتنی بڑی اور بلند ہے تو اس کا مالک کتنا بڑا اور کتنے بلند رتبے والا ہوگا۔

مانیٹر

نہم جماعت کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی۔ پہلے ہی ہفتے میں ہر کلاس کے مانیٹر متعین کر دیئے گئے تھے۔ ان مانیٹرز کو خصوصی بیج بھی دیئے گئے۔ جس پر اس طالب علم کا نام، کلاس اور نیچے جلی حروف میں ''کلاس مانیٹر'' لکھا ہوا تھا۔ اسکول کے تمام مانیٹرز ہاف ٹائم میں بریک پہلے کر لیتے تھے، تاکہ وہ پھر کلاس میں آجائیں اور کلاسوں کو خالی کرنے میں اساتذہ کی مدد کریں اور کلاس میں رکھے ہوئے لڑکوں کے بیگ اور دوسرے سامان کی حفاظت ہو سکے۔ ان لڑکوں کو خصوصی طور پر الگ بلا لیا جاتا اور ان کو کلاس کنٹرول کی ذمہ داریاں بھی سمجھائی جاتیں۔

جماعت کے مانیٹر چند ہفتوں تک تو دیانت داری سے کلاس کنٹرول کرتے رہے، لیکن پھر آہستہ آہستہ اپنے قریبی دوستوں کی ڈسپلن کی خلاف ورزی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور ان کی شکایت کرنا چھوڑ دی، جب کہ دوسرے لڑکوں کی شکایت کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔

''سر! یہ حمزہ مسلسل شور کر رہا ہے۔''

مانیٹر نے حمزہ کی شکایت کی۔

''جی حمزہ! تمہاری تین دن سے مسلسل شکایت آرہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں درس گاہ کا ماحول خراب کر رہے ہو؟''

''سر! یہ مانیٹر بلاوجہ ہماری شکایت کرتے ہیں۔'' حمزہ نے مانیٹر کی شکایت کر دی۔

''حمزہ! بس ٹھیک ہے، لیکن آئندہ تمہاری شکایت نہ آئے۔''

پھر سر فرقان نے سب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''بچو! دیکھو، اساتذہ نے مانیٹر کو کلاس کنٹرول کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ ان سے تعاون کرنا اور ان کی بات ماننا، اساتذہ سے تعاون کرنا اور ان کی بات ماننا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی عہدہ

دے تو اس سے حسد نہیں کرنا چاہیے۔
مانیٹر بننا بھی ایک اعزاز ہے، لہٰذا آپ سارے بچے مانیٹر کی ہدایت پر چلیں۔''
سر فرقان نے بچوں کو سمجھایا اور پھر سارا لیکچر اسی پر ہوا۔ وقت ختم ہوتے ہی چھٹی کی گھنٹی بج گئی۔
تمام لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے، لیکن نوید مسلسل ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ وہ بقیہ سارا دن سوچتا رہا اور آج بستر پر لیٹا تو اس تنہائی میں وہ کچھ سوچنے پر مجبور تھا۔
''مجھے تو صرف ایک چھوٹا سا عہدہ ملا کہ مجھے کلاس مانیٹر بنا دیا گیا ہے۔ میں نے حمزہ کی بلاوجہ شکایت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کتنے بلند رتبے والا ہے۔ میں اس کے آگے تو پابندی سے نہیں جھکتا۔ میری بات کوئی نہ مانے تو میں اس پر غصہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تو مجھ پر کبھی غصہ نہیں کیا۔
اس کے کلام کی تلاوت کو بہت عرصہ ہو گیا کہ چھوڑ چکا ہوں، میرا رتبہ تو ختم ہو جائے گا۔ میں نے اپنے فانی عہدے کے غرور میں آکر ناانصافی کی، رب کی بات نہ مانی، مگر اس نے کبھی میرا کھانا بند نہیں کیا۔ اس سوچ نے اسے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے کمرے میں اللہ تعالیٰ کے نام اور ان کے ترجمے آویزاں تھے۔
اس کی نظر ''اَلْجَلِیْلُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کے ترجمے پر اٹک گئی۔
''بڑے اور بلند رتبے والا'' اور پھر وہ اس عزم سے سویا کہ آئندہ وہ بھی رتبے والے کی طرف سے عطا کردہ رتبے کا خیال رکھے گا۔

یاد رکھنے کی باتیں

☆ ہم یقین رکھیں کہ بزرگی اور عظمت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور جو حیثیت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اسی پر شکر کریں۔
☆ جو لوگ ہم سے کم حیثیت والے ہیں ان سے نرمی کا معاملہ کریں۔
☆ بڑے مرتبے کے باوجود آپ ﷺ کا عمل کیسا تھا، آپ ﷺ مل جل کر رہتے تھے، گھر کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے اور مجلس میں اس انداز سے تشریف فرما ہوتے تھے کہ باہر سے آنے والوں کو مجلس دیکھ کر پتا نہ چلتا کہ اس میں آپ ﷺ کون ہیں؟
☆☆☆

معلوماتِ قرآن مجید

اسمائے مبارکہ:
القرآن، الفرقان، الذکر، الکتاب، الشفاء، الرحمۃ، ھدی الحق، نور المبین، الموعظہ، الحکمت، البلاغ، القول الفصل، حبل اللہ، احسن الحدیث، العروۃ الوثقیٰ، البرھان، الصراط المستقیم، المیزان، القرآن الحکیم، البیان۔

صفاتی نام	55
رکوع	558
کل حروف	3212670
کل نقطے	105684
سجدہ تلاوت	14
کل تشدیدات (ّ)	1253
کل سورتیں	114
مکی سورتیں	87
مدنی سورتیں	27
کل آیات	6666
کل زبر	52243
کل زیر	19582
کل پیش	8804

☆ قرآن پاک کی سات منزلیں ہیں۔
☆ قرآن پاک کی سورۃ التوبہ کا آغاز بسم اللہ سے نہیں ہوتا۔
☆ قرآن پاک کی سورۃ یٰسین کو باب القرآن کہا جاتا ہے۔
☆ قرآن پاک کی سب سے طویل سورۃ، سورۃ البقرہ ہے۔
☆ قرآن پاک کی سورۃ الرحمٰن کو زینت القرآن کہا جاتا ہے۔
☆ سورۃ فاتحہ کو قرآن پاک کا پیش لفظ یا دیباچہ کہا جاتا ہے۔
☆ قرآن کی سب سے چھوٹی سورۃ الکوثر ہے۔
☆ پہلی وحی: (اقراء) 17 رمضان المبارک میں نازل ہوئی۔
☆ قرآن پاک کی پہلی وحی غار حرا میں نازل ہوئی۔
☆ آخری وحی: 3 ربیع الاول 11ھ کو نازل ہوئی۔
☆ قرآن پاک پہلی مرتبہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔
☆ سب سے بڑے قاری اور نزول وحی کے اعتبار سے آخری کاتب وحی حضرت ابی ابن کعب انصاریؓ تھے۔
(حمزہ باقر، ملٹری کالج، جہلم)

نے مسلمانوں میں جہاد کے جذبے کو دوبارہ ابھارا اور انہیں اپنی تقریروں سے بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ صلاح الدین ایوبیؒ کی محنتیں رنگ لائیں اور اس کے لشکر میں جہاد کا شوق رکھنے والے افراد کا اضافہ ہوا۔ پھر اس نے اللہ کا نام لے کر 1177ء میں فلسطین کا رخ کیا جہاں مسلمانوں کا قبلۂ اول عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ اس کا اس سلسلے کا پہلا معرکہ بالڈون چہارم کی فوجوں کے ساتھ ساڑھے تین سال تک جاری رہا اور پھر سلطان

1138ء میں دریائے دجلہ کے دائیں کنارے پر واقع ایک قصبے ''تکریت'' میں آنکھ کھولنے والے صلاح الدین کے بارے میں کون کہہ سکتا تھا کہ ایک روز وہ عالم اسلام کا ایک عظیم حوالہ بن کر تاریخ کا حصہ بن جائے گا۔ اس کی پیدائش کے چند دن بعد ہی اس کے والد نجم الدین ایوب شام منتقل ہو گئے، جہاں سلطان عماد الدین زنگی نے انہیں ''بعلبک'' کا گورنر مقرر کیا۔ وہیں ننھے صلاح الدین نے اپنی دینی تعلیم مکمل کی۔

سلطان عماد الدین زنگی کے بعد جب نور الدین زنگی نے اقتدار سنبھالا تو اس نے نوجوان صلاح الدین کے اندر چھپی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اسے اپنے چچا اسد الدین شیر کوہ کے ہمراہ جنگی مہمات پر روانہ کرنے لگا۔ شیر کوہ کے انتقال کے بعد صلاح الدین کو مصر کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ مصر میں ان دنوں فاطمی خلیفہ العاضد کی حکومت تھی۔ اس کے انتقال کے بعد صلاح الدین نے اپنی حکمرانی قائم کر لی۔

یہ وہ دور تھا جب صلیبی افواج مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس پر قبضہ کر چکی تھیں اور وہ اپنے ناپاک ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مسلمانوں کو مزید نقصان پہنچانے کے درپے تھیں۔ اس وقت صلاح الدین ایوبیؒ عالم اسلام کے ہیرو بن کر ابھرے اور انہوں

صلاح الدین ایوبیؒ نے از سرِ نو تیاری کے لیے صلح کر لی۔ اس وقت بالڈون پنجم کی حکومت تھی۔ دو سال بعد سلطان دوبارہ نئے حوصلے اور تازہ دم فوج کے ہمراہ مسلمانوں کا قبلہ اول آزاد کرانے کی غرض سے چلا۔ مہینہ بھر ہونے والی لڑائی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور مجبوراً عیسائی سپہ سالار ریمنڈ کی خواہش پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلح کر لی۔ بادشاہ بالڈون کے انتقال کے بعد کرک کے حکمران ریجنالڈ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور مسلمان قافلوں کو لوٹنے لگا۔ وہ بے گناہ افراد کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

صلاح الدین ایوبیؒ میں فلسطین اور قبلۂ اول کو آزاد کرانے کی تڑپ تو موجود تھی، اب ریجنالڈ کے فساد نے انہیں مزید جوش دلا دیا۔ انہوں نے اس بار دریائے اردن کے راستے سفر شروع کیا اور دریا عبور کر کے طبریہ سے چھ میل دور پڑاؤ ڈالا۔ سامنے سے عیسائی افواج بھی مقابلے پر آنے کے لیے شہر سے نکلیں اور طبریہ تک آ گئیں۔ مقابلے کا آغاز اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے سے ہوا اور دونوں جانب تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ شام تک صلیبی فوجیں بُری طرح تھک چکی تھیں اور یہاں آنے کے بعد وہ خود کو بہت مجبور سمجھ رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے قریب کے پانی کے تمام ذخائر پر قبضہ کر لیا تھا۔ سلطان برابر اپنی

فوج کو جوش دلا رہے تھے۔ شام کو مسلمانوں نے دشمن کا شاہی خیمہ الٹ دیا۔ یہ دیکھ کر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ فوراً سجدہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگے۔ اب عیسائیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے لگے۔ اس جنگ میں 30 ہزار سپاہی کام آئے اور بادشاہ گائی، ریجنالڈ اور دوسرے سردار گرفتار ہوئے۔

فتح کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بادشاہ گائی، اس کے بھائی اور ریجنالڈ کو دربار میں طلب کیا۔ اس نے ریجنالڈ کو یاد دلایا کہ اس نے ایک مصری قافلے کو لوٹتے ہوئے کہا تھا کہ ''کہاں ہیں تمہارے محمد ﷺ، انہیں اپنی مدد کے لیے بلاؤ۔'' سلطان نے جوش سے کہا کہ میں تمہارے خلاف ناموس مصطفیٰ ﷺ کی حمایت کروں گا۔ اس نے ریجنالڈ کو اسلام کی دعوت دی جسے اس نے ٹھکرادیا، پھر سلطان نے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر جسم سے جدا کردیا۔

بادشاہ گائی اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کی باری ہے، مگر سلطان نے اسے تسلی دی اور کہا: ''بادشاہ، بادشاہوں کو قتل نہیں کرتے۔ لیکن ریجنالڈ شرافت کی تمام حدوں کو پار کر چکا تھا۔'' سلطان نے گرفتار شدہ لوگوں کو تحائف دے کر دمشق بھجوا دیا۔

ابھی فلسطین دور تھا اور مسلمان فوجوں کو راستے میں کئی معرکے سر کرنے تھے۔ راستے کے چند مزید علاقے سر کرتے ہوئے سلطان کی فوجیں جنوبی فلسطین کی بندرگاہ عقلان پر بھی قابض ہو چکی تھیں۔ صرف دو ماہ کے مختصر عرصے میں غزہ اور دارم سمیت کئی علاقوں پر اسلامی پرچم لہرا چکا تھا۔ اب منزل قریب تھی کہ مسلمان جس کے لیے اتنا لمبا سفر اور جہاد کا جذبہ سینے میں زندہ رکھ کر آئے تھے۔ اس سفر میں کتنے ہی مسلمانوں نے جام شہادت پیا۔ اب سلطان کی فوجیں بیت المقدس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

20 ستمبر 1187ء کو سلطان کی فوجیں بیت المقدس کے مغربی دروازے باب داؤد کے سامنے پہاڑی پر اپنے خیمے نصب کر چکی تھیں اور لڑائی کے لیے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ دوسری جانب شہر میں موجود عیسائی افواج اور عوام میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ تمام افواج سمٹ کر شہر میں آچکی تھیں اور سب کا فیصلہ تھا کہ مسلمان فوج کا مقابلہ کیا جائے۔

سلطان کی فوج پانچ روز تک بیت المقدس کا محاصرہ کیے رہی۔ جنگ کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے سلطان نے اپنی فوج کو مشرق کی جانب ایسی جگہ بھیجا جہاں شہر کی فصیل (شہر کی چار دیواری) قدرے کمزور تھی اور اگلے ہی روز اسلامی پرچم مشرقی پہاڑی جبل زیتون پر لہرا رہے تھے اور وہاں چالیس منجنیقیں (قلعہ توڑنے کا آلہ، جس سے قلعے پر بڑے بڑے پتھر پھینکے جاتے ہیں) نصب ہو چکی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد فصیل میں سوراخ ہوگیا اور مسلمان اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے شہر میں داخل ہوگئے۔ مسیحی سرداروں نے سلطان کو پیغام بھجوایا کہ ہم شہر کو تباہ کر کے جائیں گے اور اپنے مویشی، عورتیں اور بچوں کو ذبح کریں گے، زندہ کسی کو ہاتھ نہیں آنے دیں گے۔ اسی دوران انہیں ان کے بڑوں نے مشورہ دیا کہ سلطان سے صلح کی درخواست کی جائے۔ گرچہ شہر پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا قبضہ ہو چکا تھا اور ہر فاتح کسی بھی شہر کو فتح کرنے کے بعد کس طرح ظلم و ستم کرتا ہے، تاریخ کے صفحات ان تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر یہاں کوئی اور نہیں، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ تھا جس کا دل صرف مسلمان قوم کے لیے ہی نہیں دیگر اقوام کے لیے بھی پسیجتا تھا۔ ایسے رحم دل اور نرم خو حکمران کے لیے بھی دشمنوں نے طنز کے تیر چلائے ہیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلح کی درخواست منظور کر لی اور شہریوں پر فدیہ (وہ روپیہ جسے ادا کر کے قیدیوں کو رہا کرایا جائے۔ ایک ٹیکس جو غیر مذہب والوں سے وصول کیا جاتا ہے) عائد کر دیا۔ شہریوں کو پرامن شہر سے نکلنا بھی آسان بنا دیا۔ جو شہری فدیہ ادا کرنے کے قابل نہ تھے، ان کا فدیہ سلطان نے خود ادا کیا۔

یوں بیت المقدس ایک بار پھر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور دوسرے دن ہزاروں مسلمان مسجد اقصیٰ کی صفائی میں مصروف ہو گئے جسے عیسائیوں نے محل میں تبدیل کر دیا تھا اور اسے مسیحیت کا ترجمان بنا کر دیواروں پر تصاویر اور جگہ جگہ مرمریں مجسمے رکھوا دیے تھے۔ مسجد کے فرش کو دھو کر عرق گلاب چھڑکا گیا۔ سلطان نورالدین زنگی نے اپنی زندگی میں ایک خوب صورت منبر بنوا رکھا تھا جسے

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے حلب سے منگوا کر وہاں رکھوا دیا۔ مسجد میں قالین بچھائے گئے۔ میناروں پر موجود تمام گھنٹیاں، جو مسیحی دور کی علامت تھیں، ہٹا دی گئیں۔ سلطان کے حکم پر مسجد کے گنبد کا رنگ دوبارہ سبز کروایا گیا اور ایک ہفتے بعد ہی یہاں نماز جمعہ کا بڑا اہتمام ہوا۔ اس مسجد پر عیسائیوں نے 91 سال پہلے قبضہ کیا تھا جسے اکتوبر 1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے آزاد کرایا۔

اس کے بعد اطراف کی مسیحی حکومتوں نے سلطان کے ساتھ جنگ کا بازار گرم رکھا۔ وہ بیت المقدس کی فتح کے بعد سخت غم و غصے میں تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے سب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ایک ساتھی قاضی بہاء الدین ابن شداد اپنے وقت کے نامور عالم دین تھے۔ انہوں نے صلاح الدین ایوبیؒ سے متعلق لکھا ہے۔

''وہ دینی احکام کی پابندی اور شریعت کے امور کی حفاظت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ نماز باجماعت ادا کرتے اور تہجد گزار تھے۔ قرآن کی تلاوت شوق سے سنتے تھے اور اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہتی تھیں۔ احادیث سننے کا بھی شوق رکھتے تھے۔ وہ نہایت بہادر، سخی اور مستقل مزاج تھے۔''

ان کی سوانح کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک لائق سپہ سالار اور اعلیٰ سیرت کے حامل سیاست دان تھے۔ وہ ایک بڑے رقبے کے حکمران تھے، مگر سادگی اختیار کر کے انہوں نے تمام آسائشوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ہر پیر اور جمعرات کو عوامی شکایات سنتے اور موقع پر ہی حکم نافذ کرتے۔ عمر کا طویل حصہ صلیبی جنگوں میں گزرا، مگر عوام کی فلاح و بہبود کے کام سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ سلطان نے کئی مساجد بھی تعمیر کروائیں۔ ان کے دور میں نادار اور یتیم بچوں کے تعلیمی اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔ انہوں نے کئی معیاری شفا خانے بھی تعمیر کروائے۔ انہوں نے ترکے (جائیداد جو انسان کے مرنے کے بعد چھوڑ جائے) میں صرف ایک دینار اور 47 درہم چھوڑے تھے۔

4 مارچ 1193ء کو عالم اسلام کے اس عظیم رہنما نے آخری سانس لی اور اپنی جان اللہ کے حضور پیش کر دی اور اسی شام کو نماز عصر کے بعد انہیں ان کی تلوار کے ساتھ دمشق کے قلعے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی فیاضی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ فتح بیت المقدس کے بعد وہ بے دریغ سخاوت دکھا رہے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ آپ یہ مال محفوظ رکھتے تو بیت المال میں بڑا خزانہ جمع ہو جاتا اور مدتوں کام آتا۔ سلطان نے جواب دیا۔ ''مجھے فیاضی کرنے میں خوشی ملتی ہے، کیوں کہ یہ مال میرا نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا ہے جو اس کے حق دار ہیں۔ جو شخص میرے پاس آ کر اپنا حق ظاہر کرتا ہے، وہ گویا مجھ سے میری امانت واپس لینا چاہتا ہے اور میں یہ امانت لوٹا کر بے حد فرحت محسوس کرتا ہوں۔''

☆☆☆

سزا

ببلو میاں تھے تو بڑے ہوشیار اور چالاک۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتے۔ لیکن تھے حد درجہ چٹورے۔ امی کے منع کرنے کے باوجود ہر چیز صاف کر جاتے۔ ادھر باجی کیک لائی ہیں تو فوراً غائب۔ ابا جی پکوڑے لائے تو فوراً ختم۔ غرض ہر کوئی ان کی اس عادت سے عاجز تھا۔ ابا جان اور امی نصیحت کرتے کہ انسان کو متوازن غذا کھانی چاہیے لیکن ببلو میاں ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔ ان کی جیب ہر وقت ٹافیوں سے بھری پڑی ہوتی۔

ببلو میاں کو بازاری چیزیں کھانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن ٹھیلے والے سے اپنی پسندیدہ آلو چاٹ کھا رہے تھے کہ پیٹ میں اچانک شدید قسم کا درد اٹھا۔ درد اتنا شدید تھا کہ ببلو میاں تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ امی اور ابا بہت پریشان تھے۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے ان کے پیٹ میں چٹ پٹے کھانے کھانے کی وجہ سے درد ہوا ہے اور ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو بغیر نمک اور مرچوں کے کھانے کھلائے جائیں۔ اب ببلو میاں کو بغیر مرچوں کا سالن کھانا پڑتا ہے اور آئندہ کے لیے انہوں نے عہد کر لیا ہے کہ وہ بازاری کھانا نہیں کھائیں گے۔ ہمیشہ متوازن غذا کھائیں گے۔

پیارے بچو! ہمیں ہمیشہ سادہ غذا کھانی چاہیے تاکہ ہم چاق و چوبند رہیں اور ہر قسم کی بیماریوں سے محفوظ رہیں۔

(عائشہ خالد، راولپنڈی)

دانتوں کی حفاظت

دانت چہرے کے تاثرات میں بہت اہم حصہ ادا کرتے ہیں۔ دانت اگر بدنما اور میلے ہوں گے تو چہرے کی پوری ہیئت متاثر ہوگی جب کہ خوش نما دانت نہ صرف ایک فرد کی ذات کو خوش نمائی عطا کرتے ہیں بلکہ خوب صورتی میں بھی اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔

ٹافیاں، چیونگم، سویٹس وغیرہ مسلسل کھانے سے دانتوں پہ ایک چپکنے والی پروٹین کی تہہ بن جاتی ہے۔ جس میں بیکٹیریا تیزابی ایکشن پیدا کر کے دانتوں کی شکست وریخت کا باعث بنتے ہیں اور آہستہ آہستہ دانتوں کے اینمل کو نقصان پہنچاتے پہنچاتے Nerves نروز تک جا پہنچتے ہیں اور یوں درد اور ٹھنڈی گرم چیز کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے۔

بچوں کو زیادہ ٹافیاں اور سویٹس استعمال نہ کرنے دیں۔ کھانے کے بعد کلی اور دانتوں کی صفائی کا اہتمام کریں۔ 3 سال کی عمر تک کے بچوں کو صاف انگلی سے یا نرم کپڑا انگلی پہ لپیٹ کر دانتوں کی صفائی کریں اور آہستہ آہستہ انہیں برش یا مسواک کی عادت ڈالیے۔ رات سونے سے پہلے، صبح اٹھنے کے بعد اور ہر کھانے کے بعد دانتوں کی صفائی کی عادت بچوں میں ڈالیے۔

بچوں کو دانت پیسنے سے منع کریں۔ کیوں کہ اس سے دانتوں میں دراڑیں آتی ہیں اور دانتوں کی سطح کھردری ہو جاتی ہے۔

ٹوتھ پیسٹوں میں فلورائیڈ کے اجزا رکھنے والے پیسٹوں کو ترجیح دیجیے کیوں کہ یہ دانتوں کی شکست وریخت روکنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نرم ریشوں والا ٹوتھ برش بچوں کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ صحیح ترکیب سے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بچوں کو برش کرانا سکھایئے۔ برش تقریباً تین منٹ تک کرنا چاہیے۔ چھ ماہ سے دو سال تک مسوڑھے درد کریں یا بچہ تکلیف محسوس کرے تو اس کی وجہ دانتوں کا نکلنا ہوتا ہے۔ اس وقت بچے مسوڑھوں پر زبان پھیرتے ہیں۔ جس سے دانت ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دانتوں کی اندرونی سطح کی صفائی بھی بچوں کو سکھایئے۔

سال میں ایک آدھ بار دانتوں کے ماہر ڈاکٹر سے معائنہ کراتے رہنے سے بیماریوں کی ابتداء سے ہی تشخیص ہو جاتی ہے۔

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اپریل 2017ء ہے۔

نام: ________
شہر: ________
مکمل پتا: ________
موبائل نمبر: ________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 اپریل 2017ء ہے۔

نام: ________
مقام: ________
مکمل پتا: ________
موبائل نمبر: ________

ہونہار مصور

اپریل کا موضوع "پھول اور تتلیاں" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 اپریل 2017ء ہے۔

نام ________ عمر ________
مکمل پتا: ________
موبائل نمبر: ________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________
مقاصد ________
موبائل نمبر: ________

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن کہاں قائم کیا گیا؟

i۔ کراچی ii۔ لاہور iii۔ اسلام آباد

2۔ کلمۂ طیبہ میں کتنے نقطے آتے ہیں؟

i۔ ایک ii۔ دو iii۔ کوئی نہیں

3۔ صلاح الدین ایوبی نے کب وفات پائی؟

i۔1193ء ii۔1194ء iii۔1195ء

4۔ "مُردوں کا شہر" پاکستان کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ موہنجوڈرو ii۔ ٹھٹھہ iii۔ ہڑپہ

5۔ حضرت علیؒ ہجویری المعروف داتا گنج بخش کا مزار کس نے تعمیر کروایا تھا؟

i۔ ابراہیم لودھی ii۔ بہلول لودھی iii۔ سکندر لودھی

6۔ پاکستان میں کرکٹ کا پروفیسر کسے کہا جاتا ہے؟

i۔ ظہیر عباس ii۔ وسیم حسن راجہ iii۔ حنیف محمد

7۔ تانبا اور جست ملانے سے کون سی دھات بنتی ہے؟

i۔ چاندی ii۔ کلورین iii۔ پیتل

8۔ چین اور بھارت کی سرحدی حد بندی کا نام کیا ہے؟

i۔ گرین لائن ii۔ میک موہن لائن iii۔ کرزن لائن

9۔ اردو ادب میں اکبری اور اصغری کے کردار کس نے تخلیق کیے؟

i۔ ڈپٹی نذیر احمد ii۔ میر امن iii۔ حیدر بخش حیدری

10۔ اقبالؒ کا یہ شعر بالِ جبریل سے لیا گیا ہے مکمل کیجیے۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے ....

جوابات علمی آزمائش مارچ 2017ء

1- تہلیل 2- پیدائش 25 دسمبر
3- مجھے ہے حکمِ اذاں لآ اِلہ الا اللہ 4- تین مرتبہ
5- جہاں نما 6-1174ء 7- لاطینی
8- مولوی فضل حق 9- نصر الدین مرات خان 10-1930ء

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ محمد اسد، کراچی (150 روپے کی کتب)
☆ احمد عبداللہ، میاں والی (100 روپے کی کتب)
☆ عبدالرافع، لاہور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
راحان علی، لاہور۔ محمد کمیل وسیم، گوجرانوالہ۔ محمد حمزہ جاوید، کھاریاں۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ مہک وقاص، صادق آباد۔ احمد زہیہ سلیمانی، امائمہ مزمل، لاہور۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ مریم مصطفیٰ، رحیم یار خان۔ بشریٰ صفدر، چکوال۔ طٰہٰ یاسین، حیدر آباد۔ آمنہ سید، ملتان۔ علینا اختر، کراچی۔ محمد بن خالد، محمد سفی الرحمٰن، لاہور۔ حمزہ باقر، سرائے عالمگیر۔ محمد ارحم معراج، سرگودھا۔ طیبہ ذوالفقار، مریم ملک، ذوالفقار علی، گوجرانوالہ۔ عیینہ، واہ کینٹ۔ محمد قاسم سرباز، ڈیرہ غازی خان۔ محمد حامد رضا، طلحہ قطب، لاہور۔ معصومہ زہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سعد رحمٰن، گوجرانوالہ۔ عائشہ شہزاد، لاہور۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ عائشہ فاطمہ قادری، محمد قدیر قادری، محمد اکرام قادری، محمد غضنفر قادری، محمد عبدالحمید قادری، محمد سیف الرحمٰن قادری، حسن رضا سردار وصفی، نفیسہ فاطمہ قادری، خدیجہ نشان، کاموکی۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ روا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ فائقہ یونس، ہانیہ آصف، لاہور۔ حافظ لائبہ بنت الیاس، فیصل آباد۔ محمد حسین ماجد قادری، کاموکی۔ تحریم نور، گجرات۔ فائقہ عمر، فرحان علی، لاہور۔ شیخ رافع احسان حمدی، ملتان۔ محمد حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ گل فاطمہ، راول پنڈی۔ فارعہ فاطمہ، بہاول پور۔ مشعال آصف، لاہور۔ علمدار حسین، سرگودھا۔ تصور عباس، خوشاب۔ مریم منیر، چونیاں۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ محمد سعد، جڑانوالہ۔ ام کلثوم، ملتان۔ ربیعہ الیاس، لاہور۔ صائمہ کاردار، کوئٹہ۔ صفیہ بتول، کراچی۔ رقیہ ناز، بہاول پور۔ محمد احمد، لاہور۔ کامران خان، ڈیرہ غازی خان۔ صالحہ سلطان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ درشہوار، کراچی۔ ثانیہ رضا، گوجرانوالہ۔ داؤد اسلم، جہانیاں۔ صولت مہناس، کراچی۔ تصیرا اکبر، چکوال۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ریحان خورشید

حسن گروپ نے سنی کہانی

آج چھٹی کا دن تھا۔ اسی لیے تینوں بھائی اماں، کو گھیرے کھڑے تھے۔ ''اماں جان! کہانی سنائیں!'' نصف گھنٹے کے اصرار کے بعد اماں مان ہی گئیں اور پھر ہنستی ہوئیں لاؤنج میں صوفے پر آبیٹھیں۔

''ہاں تو کہانی کیسی ہو؟'' انہوں نے پوچھا تو زبیر فوراً بولا۔

''اماں! ایکشن سٹوری ہو، ساتھ میں تھوڑا ایڈونچر بھی ٹھیک رہے گا۔'' ''نہیں اماں! کامیڈی ہو!'' صہیب نے ٹانگ اڑائی۔

اماں نے دونوں کو گھورا، اسی وقت شیراز بول پڑا۔ ''اماں کوئی سبق آموز حکایت سنادیں۔''

اماں اس کی بات سن کر خوش ہوگئیں اور کہنے لگیں۔ ''تو بچو! یہ ایک جنگل کا ذکر ہے، جہاں ایک بارہ سنگھا رہتا تھا۔''

''مگر جنگل میں تو شیر رہتا ہے؟'' صہیب نے اعتراض کیا، ''ہاں وہ تو بادشاہ ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ اس کی رعایا بھی تو رہتی ہے نا!'' اماں بولیں۔

''اچھا...... اچھا،'' اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا، اماں پھر بولنے لگیں۔ ''تو ایک جنگل میں ایک بارہ سنگھا رہتا تھا، ایک دن وہ پانی پینے کے لیے گھر سے نکلا۔''

''کمال ہے اماں!'' زبیر نے کہا۔ ''کیا اس کے گھر موٹر نہیں لگی ہوئی تھی؟''

''احمق! جنگل میں اور وہ بھی جانور کے گھر میں موٹر کہاں؟'' اماں نے تیز لہجے میں کہا۔

''تو پھر میونسپلٹی سے پائپ آتا ہوگا۔''

''چپ کر کے کہانی سنو۔ جنگل کے جانور ندی سے پانی پیتے ہیں۔''

''تبھی تو جانور ہیں، اتنی عقل نہیں کہ ندی سے پانی کا کنکشن ہی لے لیں۔'' زبیر ابھی تک ان کے پانی کے غم میں الجھا ہوا تھا۔

''زبیر!'' اماں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''دوبارہ میں تمہاری آواز نہ سنوں، تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ ایک دن پانی پینے ندی پر گیا۔''

''کیا جانور ندی کے اوپر کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں؟'' اب کے صہیب بولا۔

''کیوں؟'' ''آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ وہ ندی ''پر'' گیا۔''

''اوہ! میرا مطلب ہے کہ ندی کے پاس گیا۔'' اماں نے اکتا کر کہا۔

''مگر اماں! پھر وہ ندی سے پانی کس طرح پیے گا؟'' صہیب نے پھر ٹوکا۔

''بے وقوف! اس کے پاس کوئی اسٹرا ہوگا، جس سے وہ دور سے ہی پانی پی سکتا ہوگا۔'' زبیر نے جواب دیا۔

اماں ناراض ہو کر اٹھنے لگیں تو تینوں چلائے۔ ''اماں! سوری۔''

اماں پھر بیٹھ گئیں، کہانی سنانا خود ان کا بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔

''تو سنو! وہ ندی پر پانی پینے گیا، پیتے پیتے اس کی نظر پانی پر پڑی۔''

''مگر اماں! یہ کیا بات ہوئی۔ کیا وہ پہلے آنکھیں بند کر کے پانی پی رہا تھا؟'' یہ اعتراض چوں کہ معقول تھا اس لیے اماں نرمی سے بولیں۔ ''میرا مطلب ہے کہ اس کی نظر پانی کے اندر اپنے عکس پر پڑی۔ جب اس نے اپنا عکس دیکھا تو اپنے جسم پر غور کرنے لگا، پہلے اس کی نظر اپنی ٹانگوں پر پڑی......''

''ہاہ!'' زبیر نے چیخ ماری۔ ''کیا وہ پاجامہ نہیں پہنتا تھا؟''

''زبیر! میں نے کیا کہا تھا؟'' اماں نے کہا تو زبیر دبک گیا۔

''اوہ سوری!''

''ہاں! تو جب بارہ سنگھے نے اپنی بدصورت ٹانگوں کو دیکھا تو بہت غمگین ہوا۔ ابھی وہ غم زدہ ہی تھا کہ اس کی نظر اپنی خوب صورت سینگوں پر پڑی، یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور اپنے سینگوں پر اترانے لگا۔ تبھی اسے شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔''

''اماں! پھر کیا ہوا؟''

''یہ آوازیں سن کر بارہ سنگھا ڈر گیا۔''

''پھر اماں!''

''پھر اس نے دوڑ لگا دی اور شکاری کتے اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔''

''وہ شکاری کتوں کے ساتھ مقابلہ کر رہا تھا؟''

''نہیں بے وقوف! اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ رہا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ......؟'' اماں ابھی کہہ ہی رہی تھیں کہ زبیر دوبارہ بولا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''زبیر جوتا میرے پاؤں میں ہے۔'' اماں غرائیں۔

''اوہ! میں سمجھا تھا کہ چوری ہو گیا، خیر آگے سنائیے۔''

''ہاں! تو پھر یہ ہوا کہ......'' اماں ڈرامائی انداز میں بولیں۔ ''اس کی بدصورت ٹانگیں اسے دُور بھگا لے گئیں مگر اس کے خوب صورت سینگ جھاڑیوں میں پھنس گئے، اسی وقت شکاری کتے آپہنچے۔''

''سینگ چھڑانے؟'' صہیب نے پوچھا۔ ''نہیں بے وقوف! بارہ سنگھے کو کھانے، پھر انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔''

''آپ کو کیسے پتا؟'' شیراز نے حیرت سے کہا۔

''احمق! یہ آنکھوں دیکھی بات نہیں ہے، بلکہ یہ حکایتیں تو کتابوں اور کہانیوں کے ذریعے پھیلتی ہیں، اچھا کہانی تو ختم ہو گئی، اب زبیر تم...... اس کہانی کا کوئی نتیجہ بتاؤ۔''

''میں......'' زبیر بوکھلا گیا۔ ''اس کہانی کے تین نتیجے نکلتے ہیں، کون سا سناؤں؟''

''تینوں ہی سنا دو۔''

''پھر سنیے، پہلا تو یہ کہ بارہ سنگھے، کتوں سے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں، ورنہ کتے تو ندی میں عکس دیکھتے ہی اندر چھلانگ لگا دیتے۔''

''ہوں!!'' اماں نے خون کا گھونٹ پی کر کہا۔

''دوسرا یہ کہ ندی میں پانی پیتے ہوئے اندر نہیں جھانکنا چاہیے، ورنہ مسئلہ ہو جاتا ہے، تیسرا یہ کہ......'' وہ اٹھ کر بھاگا کیوں کہ اماں کی جوتی ہوا میں پرواز کر چکی تھی۔ ''تیسرا یہ کہ ندی پر پانی پینے سے پہلے شکاری کتوں سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ اف...... آہ۔'' اماں کی جوتی اس کی کمر سے آن ٹکرائی تھی، وہ کراہتا ہوا لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

پیارے بچو! کیا آپ بھی ایسے ہی کہانی سنتے ہیں؟؟ اگر آپ کو کہانی سننے کا شوق ہے تو اپنی دادی اماں کو درمیان میں مت ٹوکیں اور خاموشی سے کہانی سنیں کیوں کہ آپس میں بات کرتے ہوئے پہلے دوسروں کو بات مکمل کرنے دیں اور اس کے بعد بولیں۔ ایسے تو پھر کہانی سننے کا مزا جاتا رہتا ہے۔ تو کیا خیال ہے ایسا ہی ہونا چاہیے؟؟ اگر نہیں تو پھر دادی اماں کی جوتی بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔

☆☆☆

ایک گونگا تین بہرے

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی گاؤں میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ بے چارہ پیدائشی بہرا تھا۔ خواہ اس کے کان پر چیخو خواہ ڈھول بجاؤ، اسے بالکل خبر نہ ہوتی۔ اس کے پاس پچاس ساٹھ بکریاں تھیں، جنہیں چرانے کے لیے وہ گاؤں سے باہر جنگل میں جاتا تھا۔ دن بھر جنگل میں بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرتا اور جب سورج ڈوبنے لگتا تو بکریوں کو ہانکتا ہوا گاؤں واپس آجاتا۔

ایک روز دوپہر کو چرواہے کو بھوک لگی تو اس نے اپنی روٹیوں کی پوٹلی تھیلے سے نکالنی چاہی، لیکن تھیلے میں پوٹلی تھی ہی نہیں۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ آخر پوٹلی گئی کہاں؟ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بیوی نے روٹیوں کی پوٹلی باندھ کر دی تو تھی، لیکن وہ اسے تھیلے میں رکھنا بھول گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب بیوی کو پتا چلے گا کہ وہ روٹیوں کی پوٹلی گھر میں بھول گیا ہے تو وہ خود لے کر چلی آئے گی۔ لہٰذا وہ بیوی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار کرتے کرتے چرواہے کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھنے لگیں اور پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ بار بار اس کی نظریں اس امید میں گاؤں کو جانے والی پگ ڈنڈی پر اٹھ جاتیں کہ شاید بیوی روٹی لے کر آرہی ہو، مگر ہر بار مایوس ہو کر واپس آجاتیں۔ اس نے سوچا، ممکن ہے بیوی نے لڑکے کے ہاتھ روٹیاں بھجوائی ہوں، مگر وہ شاید گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا ہو گا۔ یہ سوچتے ہی چرواہے کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک گھڑ سوار درانتی سے درختوں کی نرم نرم شاخیں اور پتے کاٹ رہا تھا۔ چرواہا لپک کر اس کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

''بھائی، تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم ذرا ان بکریوں کا دھیان رکھو۔ میں اپنی دوپہر کی روٹی گھر بھول آیا ہوں، بھوک کے مارے جان نکلی جا رہی ہے۔ بس جلدی سے دو چار نوالے زہر مار کر کے واپس چلا آؤں گا۔ تم ذرا بکریوں کو دیکھتے رہنا۔ کہیں کوئی بکری اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔''

اب مزے دار بات یہ ہوئی کہ وہ گھوڑے والا بھی بہرا تھا۔ چرواہے نے جو کچھ اس سے کہا، اس کا ایک لفظ بھی اس نے نہ سنا۔ اس کے بجائے وہ یہ سمجھا کہ چرواہا اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے مانگ رہا ہے اس نے جواب دیا۔

''چلو چلو، لے بنو یہاں سے۔ اتنی محنت سے تو میں نے اپنے

گھوڑے کے لیے پتے جمع کیے ہیں اور تم آ گئے مفت میں مانگنے۔ دفعہ ہو جاؤ۔ میں تمھیں ایک پتا بھی نہیں دوں گا۔

یہ کہہ کر گھوڑے والے نے ہاتھ سے چرواہے کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کی ایک بات بھی چرواہے کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن اس نے مطلب یہ نکالا کہ وہ کہہ رہا ہے، ہاں ہاں بھائی بڑے شوق سے روٹی کھانے جاؤ۔ جب تک تم واپس نہیں آجاتے، میں تمھاری بکریوں کی دیکھ بھال کرتا رہوں گا۔ یہ سمجھ کر چرواہا اپنے گاؤں کی طرف بھاگا۔

اس نے سوچا تھا کہ روٹی نہ لانے پر وہ بیوی کو خوب برا بھلا کہے گا، لیکن یہ دیکھ کر اس کی پریشانی کی حد تک نہ رہی کہ بیوی بے چاری بستر پر پڑی بخار میں پھنک رہی ہے۔ پڑوسن اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ چرواہا بھاگا بھاگا حکیم کے پاس گیا اور اس سے دوا لے کر آیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی روٹیوں کی پوٹلی کھولی، بڑے بڑے لقمے نگلے، پانی غٹ غٹا کر پیا اور دوبارہ جنگل کی طرف روانہ ہوا۔

وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ گھوڑے والا ایک طرف بیٹھا ہے۔ بکریاں گھاس چر رہی ہیں۔ چرواہے نے دل میں کہا کہ اگر آج یہ شخص نہ ہوتا تو میں بکریاں کس کے حوالے کر کے جاتا۔ اس شخص نے اپنے وقت کا کتنا ہرج کیا اور بکریوں کی نگرانی کے لیے ابھی تک بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس کی مہربانی کا کیا بدلا دے سکتا ہوں۔ ہاں، یاد آیا۔ میرے پاس جو لنگڑی بکری ہے، وہ کیوں نہ اسے دے دوں۔ اس کا گوشت بھون کر خود بھی کھائے گا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھی بھرے گا۔

چرواہے نے اس لنگڑی بکری کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور گھوڑے والے کے پاس آن کر بولا۔

''بھائی، میں تمھاری مہربانی کا بہت شکر گزار ہوں۔ معاف کرنا، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں میری بیوی بیمار ہو گئی اور میں اس کی دوا لینے کے لیے چلا گیا۔ میری طرف سے اس بکری کا تحفہ قبول کرو۔''

گھوڑے والا، جو اصل میں لکڑ ہارا تھا، چرواہے کا ایک لفظ بھی نہ سن سکا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ بکری شاید کسی درخت پر چڑھتے ہوئے گر پڑی ہے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اب اس کا ذمے دار یہ مجھے ٹھہرا رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا خون کھول گیا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

''تم اور تمھاری بکری جائے جہنم میں۔ میں کیا تمھارے باوا کا نوکر تھا جو تمھاری بکریوں کی نگرانی کرتا؟ اگر اس کی ٹانگ ٹوٹی تو میں کیا کروں؟ غائب ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

چرواہا سمجھا کہ وہ کہہ رہا ہے، یہ بکری مجھے پسند نہیں کوئی دودھ دینے والی بکری دینی ہے تو دے دو۔ اس نے کہا۔

''بھائی، میں غریب آدمی ہوں۔ انہی بکریوں کا دودھ بیچ کر گزارا کرتا ہوں۔ دودھ والی بکری تمھیں دے دوں تو اپنا پیٹ کہاں سے بھروں گا؟ تم یہی بکری لے لو۔''

''ارے بے وقوف! میں کہتا ہوں یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' لکڑ ہارا پھر چلّایا۔ اس کا خیال تھا کہ چرواہا دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر تم نے بکری کی قیمت ادا نہ کی تو بہت برا ہو گا۔ ''میں تمھاری بکریوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے ان سے کوئی دل چسپی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تمھاری یہ شریر بکریاں کس طرف چر رہی تھیں۔ اب زیادہ میرا مغز نہ کھاؤ، ورنہ میں تمھیں ماروں گا۔''

چرواہے نے دیکھا کہ لکڑ ہارے کی آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں اور نتھنے پھڑک رہے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے! میں نے اس شخص کو گالی تو نہیں دی۔ بکری کا تحفہ ہی پیش کیا تھا۔ اس نے پھر اس سے بکری قبول کر لینے کی درخواست کی، مگر لکڑ ہارا غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹھ کر ایک گھونسا چرواہے کے مارا۔ چرواہے کو بھی طیش آ گیا۔ اس نے جواب میں دو گھونسے اس کی پسلیوں میں رسید کیے۔ پھر تو دونوں میں ایسی خوف ناک لڑائی ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔ ان کی لڑائی دیکھ کر لکڑ ہارے کا گھوڑا ہنہنایا۔ ادھر چرواہے کی بکریاں مل کر میں میں کرنے لگیں۔

اتنے میں مسافر، گھوڑے پر سوار، ادھر سے گزرا اور ان دونوں کو لڑتے دیکھ کر نزدیک آیا۔ پوچھنے لگا۔

''بھئی کیا بات ہوئی؟ کیوں لڑ رہے ہو؟''

چرواہے نے کہا۔ ''دیکھیے جناب، میں اسے لنگڑی بکری مفت دے رہا ہوں کیوں کہ اس نے میری بکریوں کی رکھوالی کی ہے مگر یہ دودھ والی بکری لینا چاہتا ہے۔ جب میں نے انکار کیا تو لڑنے مرنے پر تل گیا۔''

مسافر نے اپنے بائیں کان پر ہاتھ رکھا اور زور سے بولا۔ ''بھئی، معاف کرنا میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔ تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑی۔ پھر سے کہو اور ہاں، ذرا اونچی آواز سے۔''

اتنے میں لکڑ ہارے نے اپنا بیان شروع کر دیا۔ وہ سمجھا کہ مسافر اس سے پوچھ رہا ہے کہ تم بتاؤ کیا واقعہ پیش آیا؟ لکڑ ہارے نے اس کے گھوڑے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ والا، میں اپنے گھوڑے کے لیے جنگل میں سے گھاس کاٹ رہا تھا کہ یہ کم بخت چرواہا نہ جانے کہاں سے غائب ہو گیا اپنی بکریوں کو چھوڑ کر۔ پھر بہت دیر میں واپس آیا اور ایک لنگڑی بکری لا کر میرے سامنے ڈال دی اور کہنے لگا کہ اس کی ٹانگ تو نے توڑی ہے۔ اب میں اتنی دیر سے اسے سمجھا رہا ہوں کہ بکری کی ٹانگ میں نے نہیں توڑی، لیکن مانتا ہی نہیں۔ برابر وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ میں نے پہلے زبان سے سمجھایا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ میں نے اس کی خوب ٹھکائی کی۔ تب ہوش ٹھکانے ہوئے۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیے۔''

مسافر حیرت سے منہ کھولے لکڑ ہارے اور چرواہے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا۔ وہ بھی انہی دونوں کی طرح کانوں سے بہرا تھا۔ جب لکڑ ہارے نے اس کے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا تو وہ ایک دم ڈر گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہاں...... یہ گھوڑا میرا نہیں۔ میں تو پیدل سفر کر رہا تھا کہ ایک جگہ جنگل میں یہ مجھے آوارہ پھرتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اب آپ لوگ کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا آپ کا ہے تو میں اسے آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ امید ہے آپ میری اس حرکت کو معاف کر دیں گے۔''

یہ کہہ کر مسافر نے اپنا گھوڑا وہیں چھوڑا اور اندھا دھند ایک طرف بھاگ نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو یہ لوگ مجھے گھوڑے کی چوری کے جرم میں پکڑ کر قاضی کے پاس لے جائیں اور وہ مجھے قید خانے میں ڈال دیں۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر لکڑ ہارا اور چرواہا دونوں اس کے پیچھے دوڑے اور دیر تک تعاقب کرنے کے بعد آخر کار اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر وہ اسے کھینچتے ہوئے واپس وہیں لائے اور اصرار کرنے لگے کہ جب تک تم ہمارے جھگڑے کا فیصلہ نہیں کر دیتے تمہیں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔

ابھی ان تینوں بہروں میں تکرار ہو ہی رہی تھی کہ ایک فقیر ادھر آنکلا۔ تینوں نے اسے گھیر لیا اور باری باری اپنا مقدمہ بیان کرنے لگے۔ فقیر ان کی باتوں کا ایک ایک لفظ اچھی طرح سن رہا تھا، لیکن وہ کوئی فیصلہ سنانے سے عاجز تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ پیدائشی گونگا تھا۔

اس نے ان تینوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا فقیر کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک تھی کہ یہ تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ فقیر برابر انہیں دیکھتا رہا۔ انہیں ایسا لگا جیسے اس کی نگاہیں ان کی کھوپڑیوں کے پار ہوئی جا رہی ہیں۔ یکایک گھوڑے والا مسافر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر وہاں سے آناً فاناً رفو چکر ہو گیا۔

لکڑ ہارے نے بھی جلدی جلدی گھاس اور پتے اپنی پیٹھ پر لادے اور بھاگ نکلا۔ چرواہے نے اپنی بکریوں کو ہانکا اور گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ فقیر وہیں کھڑا انہیں دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ جب یہ تینوں بہرے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ بھی اپنی راہ پر ہو لیا۔ اس نے سوچا، بے شک بولنے کی قوت بہت بڑی نعمت ہے لیکن اگر کوئی شخص میری طرح گونگا ہو تو یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔

صدقہ کی برکات

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ سات چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب بندہ (انسان) کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور یہ قبر میں پڑا رہتا ہے۔ جس نے علم (دین) سکھایا، یا کوئی نہر کھودی، یا کوئی کنواں کھدوایا، یا کوئی درخت لگایا، یا کوئی مسجد بنائی، یا قرآن ترکہ میں چھوڑا گیا یا کوئی اولاد چھوڑ دی جو اس کے مرنے کے بعد بخشش کی دعا کرے۔ (ترغیب از بزاز وابونعیم) اور ابن ماجہ درخت لگانے اور کنواں کھدوانے کے صدقہ اور مسافر خانہ کا ذکر کیا (ترغیب) اس حدیث سے دینی مدرسہ کی اور رفاعہ عامہ کے کاموں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا صدقہ دینے سے مال میں کمی نہیں ہوتی۔

(حیوۃ المسلمین)

پ	د	ض	ن	و	م	ب	ر	ک	ن
ء	ش	ت	ک	غ	ب	ض	م	ا	ل
خ	ر	ن	د	ع	ز	م	ق	گ	ت
ث	ا	ا	ض	ظ	ل	ب	ہ	س	ط
ظ	پ	د	ج	ت	ع	ن	ر	ت	ع
م	ر	ر	گ	ت	و	ا	ل	ت	ن
ا	ی	ر	ل	ح	ا	س	ا	ف	ا
ک	ل	و	ب	ج	س	ژ	ڈ	د	م
م	ا	ظ	ق	ر	آ	ن	گ	ر	ت
ل	ز	ن	ح	م	د	چ	ق	س	ج

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

عزم، اگست، اپریل، ساحل، نومبر، حمد، درس، نعت، قرآن، تلاوت

میری زندگی کے مقاصد

عبدالستار جھنگوی، جھنگ

میں جہالت کے خلاف جہاد کر کے اپنے ملک پاکستان کی خدمت کروں گا۔

عبدالرحمٰن، کراچی

میں بڑا ہو کر پاک آرمی کی انٹیلی جنس جوائن کروں گا۔

حسن وقاص، لاہور

میں بڑا انجینئر بن کر اپنے ملک اور والدین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد بلال رضا، جوہر آباد

میں بڑا ہو کر اسلامی سکالر ہوں گا۔

گل شان سردار، ساہیوال

میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

مہ نور جابر خان، میرپور

میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں تاکہ میں لوگوں کی خدمت کر سکوں اور ملک کے کام آؤں۔

محمد انس، لاہور

میں بڑا ہو کر فوجی افسر بنوں گا۔

عثمان، راول پنڈی

میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کے لیے اپنی جان قربان کروں گا۔

روحما النصر، گوجرانوالہ

میں پائلٹ بننا چاہتی ہوں اور ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

عروش عمیر، لاہور

میں تعلیم حاصل کر کے ملک کا نام روشن کروں گی۔

مشعال آصف، لاہور

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی، غریبوں کا مفت علاج کروں گی اور اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

میرب شبیر، کراچی

میں پروفیسر بن کر ملک کی خدمت کروں گی۔

سیدہ زینب احمد، اسلام آباد

میں ٹیچر بننا چاہتی ہوں۔

ایمن قطب، لاہور

میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور بچوں کو دین اسلام کی تعلیم دوں گی۔

شہیر احمد خان، کراچی

میں انجینئر بنوں گا اور نئی نئی چیزیں ڈیزائن کر کے ملک کا نام روشن کروں گا۔

ندا افتخار، چشتیاں

میں ان شاء اللہ آرٹسٹ بنوں گی۔

مناعم حسین، راول پنڈی

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

محمد حسین، بہاول پور

میں عالم باعمل بنوں گا اور دین کی روشنی پھیلاؤں گا۔

عشبہ فاطمہ انجم، فیصل آباد

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور خدمتِ خلق کروں گی۔

حفظانِ صحت

ہندو ہوں یا سکھ عیسائی یا ہوں مسلمان
صحت اور صفائی پر ہے ان سب کا ایمان
خالق نے جب خلق کیا تھا حضرتِ انسان
عقل کی دولت اس کو دے کر اس پہ کیا احسان
روشن روشن چاند ستارے اُجلی اُجلی دھوپ
صاف اور ستھرے ٹھنڈے چشمے جینے کا سامان
مصحف ہوں یا پاک کتابیں سب میں کیے تحریر
پاکیزہ ماحول میں رہنا ہے جزو ایمان
دنیا میں حفظانِ صحت کے ہیں چند اصول
جن پر چلنا کر دیتا ہے منزل کو آسان
صحت اور صفائی دونوں ہیں لازم ملزوم
صحت اور صفائی سے ہے قوموں کی پہچان
آنے والی نسلوں کو یہ عہد نبھانا ہو گا
صاف اور ستھرا پاکیزہ ہو اپنا پاکستان

(کرامت بخاری، لاہور)

اکبر کا خواب

ایک دن شہنشاہ اکبر کو خواب آیا کہ اس کے تمام دانت گر گئے ہیں۔ اگلے روز اس نے تمام نجومیوں کو بلایا۔ اس نے انہیں اپنے عجیب و غریب خواب کے بارے میں بتایا اور ان سے خواب کا مطلب دریافت کیا۔ نجومیوں نے آپس میں خواب کے بارے میں بحث کی اور آخر کار کہا۔ ''عالی جاہ! آپ کے خواب کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے تمام رشتہ دار آپ سامنے فوت ہوں گے۔ شہنشاہ نجومیوں پر غضب ناک ہو گیا اور سب کو دربار سے چلے جانے کا حکم دیا اور بیربل کو خواب کی وضاحت کرنے کو کہا۔ بیربل نے تھوڑی دیر غور کیا اور کہا۔ ''عالی جاہ! آپ کا خواب پر اسرار معنی کا حامل ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے رشتہ داروں سے لمبی عمر پائیں گے۔ اکبر بادشاہ بیربل کی دانائی سے بہت خوش ہوا اور اس کو انعام سے نوازا۔

(معوذ الحسن، ڈیرہ غازی خان)

ایاز کے بیٹے

پیارے بچو! سلطان محمود غزنوی کے ایک غلام کا نام محمد تھا۔ ایک دن سلطان نے محمد کی بجائے ''اے ایاز کے بیٹے'' کہہ کر پکارا تو وہ غلام کانپ اٹھا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے اس لیے میرا نام نہیں لیا۔ سلطان محمود غزنوی نے کہا۔ ''نہیں ...... نہیں ...... کوئی غلطی نہیں ہوئی دراصل آج میرا وضو نہیں ہے اور میں نے بغیر وضو کبھی اس ذات پاک کا نام نہیں لیا اس لیے آج کیسے لے لیتا۔''

تو پھول سے پیارے بچو! یہ ہے حضرت محمدؐ کی ذات پاک کا احترام۔ اس کے علاوہ ہمیں بھی ہر لمحہ باوضو رہنا چاہیے کیوں کہ جو شخص باوضو رہتا ہے تو رحمت کے فرشتے اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کے نامہِ اعمال میں مسلسل نیکیاں لکھتے رہتے ہیں۔

(محمد الیاس، وہوا)

پیاری عائشہ

عائشہ کتنی پیاری ہے
سب کی راج دلاری ہے
سب سے دیکھو ہاتھ ملائے
سب کے دل کو یہ بھائے
سب سے گھل مل جاتی ہے
سب کے پاس آجاتی ہے
آنکھیں پیاری پیاری ہیں
باتیں پیاری پیاری ہیں
مما کی ہے یہ راج دلاری
پاپا کی ہے یہ شہزادی
نانی کی ہے یہ دعا
ہر دم ہنستی رہے سدا
اللہ اس کو نیک بنانا
نیکی کے رستے پہ چلانا
اللہ اس کو شاد رکھے
ہر غم سے آزاد رکھے

(کاوش: ثمرہ ندیم، لاہور)

حضرت عمرؓ کی سادگی

حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے بیت المقدس میں آنے کی اطلاع اسلامی لشکر میں پہنچ چکی تھی۔ اس لیے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے استقبال کے لیے سب سے آگے حضرت یزیدؓ بن ابو سفیان کو روانہ کیا اور ان کے بعد خود چلے اور ان کے پیچھے حضرت خالدؓ روانہ ہوئے۔ یزیدؓ بن ابو سفیان اچھا لباس پہنے ہوئے تھے۔ جب وہ حضرت عمرؓ کے سامنے پہنچے تو آپ ان کا لباسِ فاخرہ دیکھ کر نہایت غضب ناک ہوئے اور فرمایا: ''کیا عجمیوں اور شامیوں کا اثر تم پر

بھی ہو گیا ہے۔''

(محمد عبداللہ، ملتان)

نمکین غزل

کسی کا ماضی اور کسی کا حال ہیں ہم
اور کس کے لیے وبال ہیں ہم
جس کو کوئی بھی حل نہ کر پائے
ایک الجبرا کا سوال ہیں ہم
لوگ کہتے ہیں دنیا گول سی ہے
گول گول گھوم کے بے حال ہیں ہم
دشمنی ہم کسی سے کرتے نہیں
اور دوستوں کی شامتِ اعمال ہیں ہم
نزّی خود سے بھی لاتعلق ہے
دیکھو تو کتنے با کمال ہیں ہم

(نازیہ نزّی، نوشہرہ کینٹ)

سنہری باتیں

☆ اچھی سوچ اچھا اور بری سوچ برا پھل دیتی ہے۔
☆ انسان ہو تو ایسا کام نہ کرو، جس سے انسانیت کا دامن داغ دار ہو۔
☆ کام یابی ان کو ملتی ہے جو ہمیشہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔
☆ محنت کرو گے تو تمہاری زندگی پھولوں کی طرح رنگین اور شہد کی طرح میٹھی ہو جائے گی۔ (راجہ فرخ حیات، پنڈ دادن خان)

پاپ سنگر

مغربی تہذیب کی بجتی ہے جب محفل کوئی
بھول جاتے ہیں سبھی کردار کے معیار کو
پاپ سنگر اس طرح کرتے ہیں پھر چیخ و پکار
جیسے چھو جائے کسی کا ہاتھ ننگے تار کو

(انتخاب: بشریٰ تنویر، کوئٹہ)

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ فرماتے ہیں:

☆ علم سے بے پرواہی کرنا محض کفر ہے۔
☆ حرام کے لقمہ سے پرہیز کرو۔
☆ بھید کو نہ کھول اور نماز کو نہ بھول۔
☆ عارف عالم بھی ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ عالم عارف بھی ہو۔
☆ اللہ تعالیٰ شکستہ دلوں میں پایا جاتا ہے۔ (طلحہ باقر، سرائے عالمگیر)

منافقت

کسی مشاعری میں ایک نومشق شاعر اپنا غیر موزوں کلام پڑھ رہے تھے۔ اکثر شعراء آدب محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے، لیکن جوش ملیح آبادی پورے جوش و خروش سے ایک ایک مصرع پر دادِ تحسین کی بارش کیے جا رہے تھے۔

گوپی ناتھ امن نے ٹوکتے ہوئے پوچھا: ''قبلہ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

جوش صاحب نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''منافقت''

(نظیمہ زہرہ، لاہور)

اقوال سعدیؒ

☆ موتی چاہے کیچڑ میں بھی گر جائے، موتی ہی رہتا ہے۔
☆ عاقبت کی فکر بھی اللہ کا انعام ہے۔
☆ صرف جوہرِ قابل پر تعلیم و تربیت کا اثر ہوتا ہے۔
☆ قناعت دنیا کے مال و زر سے بڑی دولت ہے۔
☆ دل کی بات قریبی دوست سے بھی بچا کر رکھو۔
☆ اسلام تلوار سے نہیں حسنِ اخلاق سے پھیلا۔

(مریم رضوان، راول پنڈی)

فضول خرچی

شیخ سعدی کے پڑوس میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ اسے اپنے چچا کے مرنے پر بہت سا مال ترکے میں ملا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم کے مطابق اس نے دونوں ہاتھوں سے یہ دولت فضول خرچی میں اڑانی شروع کر دی۔ شیخ نے ایک بار اسے نصیحت کی کہ اے بیٹے! آمدنی سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے؟

اس نوجوان نے شیخ کی نصیحت کو دیوانے کی بڑ سمجھا اور بولا۔ ''آج کی راحت چھوڑ کر کل کے غم میں دبلا ہونا حماقت ہے۔'' یہ سن کر شیخ سعدی خاموش ہو گئے کیوں کہ داناؤں کا قول ہے کہ جو چیز تجھ پر واجب ہے تو لوگوں تک پہنچا دے۔ اگر کوئی قبول نہ کرے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں۔

کچھ عرصے بعد وہی ہوا۔ اس نوجوان نے تمام جائیداد فضول خرچی اور عیاشی میں برباد کر ڈالی اور ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو گیا۔

(محمد علی رضا، فیصل آباد)

1- اوپر یا وہ نیچے جائے
قدم قدم پر جوتے کھائے

2- جس نے پایا ایک ہی پایا
پھر وہ ہمیشہ کام آیا

(سعد مظہر)

3- دور پہاڑ پر سے آئے
گھر میں آ کر گھل مل جائے

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

4- جو بھی اس پر آنکھ جمائے
جو نہ دیکھو وہ دکھلائے

5- ہری ہری پانی میں گھولی
لال بنی جب مٹھی کھولی

(ثناء لیاقت، حویلی لکھا)

6- اونچا اونچا اڑتا جائے
دیکھو ایک پرندہ
ہوا کو چیرے بادل پھاڑے
جیسے کوئی درندہ

7- لکڑی کا اک بکس ہے
آگ سے ہے بھرا
جلایا بجھایا اس کو
جیب میں ڈال چلا

(حمزہ عثمان، چونیاں)

8- چینی کا پیالہ ٹوٹا
کھانے والا ہووے موٹا

9- چھری ماروں یا تلوار
نہ وہ کٹے نہ وہ مرے

(احور کامران، لاہور)

10- کھانے کی یہ چیز نہیں
مگر اسے ہر کوئی کھائے

(عائشہ مریم، چونیاں)

جوابات: 1- سیڑھی 2- نام 3- نمک 4- دوربین 5- مہندی
6- ہوائی جہاز 7- ماچس 8- انڈہ 9- پرچھائیں 10- قسم

نقطے ملائیے۔

عالمی دن برائے کتب اطفال

ہر سال 2 اپریل کو بچوں کی کتابوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے جسے عموماً انٹرنیشنل چلڈرن بک ڈے بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ دن بچوں کے معروف لکھاری Hans Christian Anderson کا یومِ ولادت ہے۔ یہ لکھاری 2 اپریل 1805ء کو ڈنمارک میں

پیدا ہوئے۔ آپ نے سینکڑوں کہانیاں، کتب، ناول، سفرنامے، نظمیں اور بچوں کے لیے تصوراتی کہانیاں تخلیق کیں۔ آپ کی یاد میں اِس دن کو بچوں کے لٹریچر کے فروغ کے لیے دنیا بھر میں منایا جاتا ہے۔ آپ نے 4 اگست 1875ء کو وفات پائی۔ بچوں کے لیے شاہکار تخلیق کرنے والے اس لکھاری کی یاد میں ڈنمارک میں 1935ء کو ڈاک ٹکٹ جاری ہوا۔ اسی طرح اسلامی ممالک میں قازقستان نے اس رائٹر کی خدمات کے اعتراف میں 2005ء کو ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ دنیا بھر میں اس روز بچوں کے رسائل کی نمائش کی جاتی ہے اور کتاب میلے میں بچوں کو سستی کتابیں خریدنے اور مطالعہ کرنے کا موقع بھی دیا جاتا ہے۔

ڈیزی

ڈیزی (Daisy) ایک خوب صورت پھول دار پودا ہے جس کا پھول خوب صورتی کے لیے مشہور ہے۔ ڈیزی کا مطلب ہے ''Day's Eye'' کچھ لوگ اسے ''Mary's Rose'' بھی پکارتے ہیں۔ اس کا سائنسی نام ''Bellis Perennis'' ہے جب کہ خاندان ''Asteraceae'' ہے۔ ڈیزی کو گلِ

معصوم، عربی میں ''بلیس معمر'' اور فارسی میں ''مینائی چمنی'' کہا جاتا ہے۔ یہ پھول بہار میں کھلتا ہے۔ اس لیے اسے فلاور آف اپریل بھی کہتے ہیں۔ یہ سدا بہار پودا ہے جس کے پتے 2 سے 5 سینٹی میٹر لمبے اور چپٹے ہوتے ہیں۔ پھول گچھے کی شکل میں نکلتے ہیں جسے فلاور ہیڈ (Flower Head) پکارا جاتا ہے۔ یہ گچھا درمیان میں ہوتا ہے جسے Sessile فلاور کہتے ہیں جب کہ ان کے باہر کی طرف پتیاں (Petals) نکلتی ہیں جنھیں ''Ray Floret'' کہا جاتا ہے۔ اس پودے کی طبی اہمیت بھی ہے۔ آسٹریا کے لوگ اس پھول کو بطور ہربل ٹی (Tea) استعمال کرتے ہیں جب کہ اہلِ یورپ اس کے پتے سلاد میں استعمال کرتے ہیں کیوں کہ ان میں کیلوریز (Calories) کم ہوتی ہیں

لہٰذا شوگر کے مریض بھی کھا سکتے ہیں۔ اس پھول سے وٹامن A اور وٹامن C کے علاوہ پروٹینز، فولیٹ، میگنز اور وٹامن K بھی حاصل ہوتے ہیں۔

یو ایس بی

یو ایس بی (USB) کمپیوٹر کی دنیا میں ایک معلومات ذخیرہ کرنے والی دست گاہ (Device) ہے جو USB ڈرائیو، USB سٹک، پین ڈرائیو (Pen Drive)، فلیش ڈسک بھی

کہلاتی ہے۔ درحقیقت USB، "Universal Serial Bus" کا مخفف ہے۔ یہ 1996ء میں مارکیٹ میں متعارف ہوئی۔ اسے تیار کرنے کا سہرا مختلف ڈیزائنرز کے سر ہے جن میں Compaq، Dell، IBM، Intel، Microsoft، Nel اور Nortel شامل ہیں۔ عموماً USB کی لمبائی 2 سے 5 انچ ہوتی ہے۔ USB کا جو حصہ کمپیوٹر میں جا کر جڑتا ہے اسے میل پلگ (Male Plug) کہا جاتا ہے۔ USB کا خول (Cover) پلاسٹک یا دھات (Metal) کا بنا ہوتا ہے۔ USB کی چوڑائی 8.2 ملی میٹر سے 12 ملی میٹر ہوتی ہے۔ اسی بنا، پر انہیں ٹائپ C سے ٹائپ A تک تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلی USB کو USB 0.8 کہا گیا۔ اسی طرح 2013ء میں دستیاب USB کو USB 3.1 کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح نام دینے کا تعلق معلومات کے تبادلے کی رفتار (Speed) سے ہے۔

میٹھا سوڈا

کھانے والا سوڈا (Baking Soda)، میٹھا سوڈا بھی کہلاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام سوڈیم بائی کاربونیٹ (Sodium bicarbonate) ہے۔ اس کا کیمیائی فارمولہ "$NaHCO^3$" ہے۔ یہ ایک طرح کا نمک ہے جو سوڈیم اور بائی کاربونیٹ آئنز سے مل کر بنتا ہے۔ ایک فرانسیسی کیمیا دان "Nicolas Leblanc" نے سوڈا ایش کے نام سے اسے تیار کیا۔ جب کہ امریکن شہر نیو یارک میں 1846ء کو باضابطہ طور پر اس کی تیاری شروع کی گئی۔ یہ بے بو کیمیائی مادہ ہے جس کی کثافت (Density) بطور ٹھوس $2.2g/cm^3$ جب کہ نقطہ پگھلاؤ 50°C ہے۔ میٹھا سوڈا کھانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سفید چنے پکانے سے قبل میٹھا سوڈا ڈالنے سے چنے پھولے پھولے پکتے ہیں۔ اس طرح خمیر (Dough) کی تیاری، بسکٹ، کیک، کوکیز، سینڈوچ، نوڈلز، پاستا، پیزا وغیرہ کی تیاری میں بھی میٹھا سوڈا استعمال ہوتا ہے۔ کچن کی پائپ لائن میں میٹھا سوڈا ڈالنے سے کاکروچ مر جاتے ہیں اور دیواروں سے پرانا رنگ اتارنے کے لیے بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ "Baking Soda" خالص سوڈیم بائی کاربونیٹ ہوتا ہے جب کہ "Baking Powder" میں دیگر نمکیات مثلاً پوٹاشیم وغیرہ بھی شامل ہوتا ہے۔

☆☆☆

ضرب المثل کہانی

زبیدہ سلطانہ

دو کشتیوں کا سوار ہمیشہ ڈوبتا ہے

فہیم گھاٹ پر پہنچا تو کشتی بھر چکی تھی، مگر وہ پھر بھی جلدی سے چھلانگ لگا کر کشتی میں سوار ہو گیا اور کسی نہ کسی طرح جگہ بنا کر بیٹھ ہی گیا۔ اسے دریا پار کر کے دوسرے گاؤں میں ضروری کام سے جلدی پہنچنا تھا۔

کشتی جو بہت بڑی تھی اور سواریاں بھی زیادہ تھیں، بہت آہستہ چل رہی تھیں۔ ملاح بڑی احتیاط سے کشتی کو کھیتا اور مزے مزے سے راگ الاپتا چلا جا رہا تھا۔ ادھر فہیم کو کشتی کی اس سست رفتاری پر الجھن ہو رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد منزل پر پہنچ جائے۔ جب کشتی بیچ منجدھار میں پہنچی تو پیچھے سے ایک چھوٹی سی سبک رفتار کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ فہیم دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ کاش! وہ تھوڑی دیر اور گھاٹ پر رک گیا ہوتا تو بعد میں آنے والی اس کشتی میں بیٹھ جاتا۔ اسی وقت اس کے دل میں ایک اور خیال آیا...... ”کیوں نہ تیر کر اس کشتی تک پہنچ جائے اور اس میں سوار ہو جائے؟“

جب وہ چھوٹی کشتی، بڑی کشتی کے برابر پہنچی تو فہیم نے پکار کر اس کے ملاح سے کہا کہ کشتی کو برابر لے آئے کیوں کہ وہ اس پر منتقل ہونا چاہتا ہے۔ دوسرے مسافروں نے لاکھ منع کیا کہ صبر سے بیٹھا رہے اور ایسا خطرہ مول نہ لے مگر فہیم اور بھی جوش میں آ گیا۔ اب اسے ضد کے مارے یہ اپنی انا کا مسئلہ محسوس ہونے لگا کہ اب وہ دوسری کشتی پر جا کر رہے گا۔ دوسری کشتی کا ملاح بھی ایک لاابالی قسم کا نوجوان تھا۔ اسے بھی یہ تماشا دل چسپ معلوم ہوا۔ وہ اپنی کشتی کو بڑی کشتی کے برابر لے آیا۔ فہیم نے اٹھ کر جیسے ہی چھوٹی کشتی میں قدم رکھنا چاہا، ایک تیز لہر آئی اور کشتی لہرا کر کئی فٹ دور ہٹ گئی۔ فہیم غڑاپ سے دریا میں جا گرا۔ پانی کی موج اسے کشتی کے نیچے لے گئی مگر وہ ایک اچھا تیراک ہوتے ہوئے بھی پانی کی سطح پر ابھر نہ سکا۔ دونوں کشتیوں میں سے کسی سوار کو حوصلہ نہ ہوا کہ وہ دریا میں اتر کر فہیم کو بچانے کی کوشش کرتا، کیوں کہ منجدھار میں پانی بہت گہرا تھا۔ سب لوگ صرف ہاتھ مل مل کر افسوس ہی کرتے اور کہتے رہے: ”دو کشتیوں کے سوار کو تو ڈوبنا ہی تھا۔“

جب کوئی شخص ایک ہی وقت میں دو کام کرنا چاہے تو وہ ایک کام بھی اچھی طرح نہیں کر سکتا اور نقصان اٹھاتا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر یہ مثل کہی جاتی ہے۔

☆☆☆

پن مکڑی

پانی میں رہنے والے جانوروں کے اعضاء کی خاص بناوٹ ہوتی ہے۔ اکثر مخلوق زندہ رہنے کے لیے پانی میں حل شدہ آکسیجن استعمال کرتی ہے۔ بعض مچھلیاں (مثلاً وہیل) تھوڑے تھوڑے وقفے سے سطح آب پر آکر سانس لیتی ہیں۔ جانوروں کی ایک قسم جنہیں ''جل تھلیے'' (Amphibians) کہتے ہیں، پانی اور خشکی دونوں پر رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن یہ بھی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔

خشکی پر رہنے والے جانور پانی کے اندر رہائش اختیار نہیں کر سکتے۔ انسان بغیر غوطہ خوری کے مناسب آلات کے، پانی میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ خشکی کا جانور اگر کنویں، تالاب یا دریا میں جا گرے تو ڈوب کر مر جاتا ہے لیکن قدرت کے بعض کام ایسے نیارے ہیں کہ اس کے سامنے سارے مروجہ اصول دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

پن مکڑی (Water Spider) کو اپنے جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے خشکی پر رہنا چاہیے تھا لیکن یہ نہ صرف بہت اچھی تیراک ہے بلکہ مستقل طور پر پانی (تالابوں) میں گھر بنا کر رہتی ہے۔ یہ وہیں سے غذا حاصل کرتی ہے، وہیں انڈے دیتی ہے اور وہیں اس کے بچے پرورش پاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ پن مکڑی کو زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس نے ایک منفرد انتظام کیا ہے۔ یہ عام مکڑی کی طرح جالا بنانے کے بجائے ایک ''ریشمی تھیلا'' بُنتی ہے جس میں ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس تھیلے کو وہ پانی میں اگنے والے کسی پودے کے ساتھ چپکا دیتی ہے۔ تھیلے میں ہوا بھرنے کا طریقہ بھی بڑا نرالا ہے۔ اس کے جسم کے نچلے حصے پر باریک لیکن بہت گھنے بال ہوتے ہیں۔ جن کے درمیان ہوا ٹھہر سکتی ہے۔ پن مکڑی پانی کی سطح پر الٹی ہو جاتی ہے اور اپنی پچھلی ٹانگوں کے بیچ والے بالوں کے گچھے میں ہوا بھر لیتی ہے پھر پانی میں واپس آکر یہ ہوا اپنے تھیلے میں خارج کر دیتی ہے۔ اس طرح کئی بار یہ عمل کرنے سے تھیلا تازہ ہوا سے بھر جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک یہ اپنے ''ریشمی گھر'' میں آرام سے رہتی ہے۔ جب تھیلے کی ہوا میں آکسیجن ختم ہونے لگتی ہے تو مکڑی دوبارہ اسے تازہ ہوا سے بھر لیتی ہے۔

پن مکڑی پانی میں رہنے والے کیڑے مکوڑے، چھوٹے مینڈک اور مچھلیاں کھاتی ہے۔ جب کوئی بدقسمت کیڑا اس کے گھر کے قریب سے گزرتا ہے تو یہ باہر آکر اسے پکڑ لیتی ہے اور پھر گھر کے اندر لے جا کر مزے سے کھاتی ہے۔

Water Spider ایک چھوٹے سائز کی مکڑی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ 10 ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ عام مکڑیوں کے برخلاف اس کی مادہ نر سے موٹی ہوتی ہے۔ مادہ ایک دوسری سفید ریشمی تھیلی تیار کر کے اس میں انڈے دیتی ہے اور انہیں چھوڑ کر واپس اپنے تھیلے میں آجاتی ہے۔ بچے اسی تھیلی میں نکلتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں اور پھر اپنے الگ الگ گھر آباد کر لیتے ہیں۔

☆☆☆

اشفاق احمد خاں

قندِ مکرر

انوکھی خواہش

مدثر نے اپنے دوست اعجاز کے گھر کے باہر لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد اس کا ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

''بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ کرکٹ کا میچ اپنے آخری لمحوں پر ہے۔ بڑا سنسنی خیز مرحلہ ہے۔ آؤ، آؤ، جلدی سے آؤ'' اتنا کہہ کر اعجاز نے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ پھر وہ میچ میں اتنے مگن ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ تو اس وقت چونکے جب ڈرائیونگ روم کے اندرونی دروازے پر دستک ہوئی اور ایک تیز آواز ابھری۔ ''اعجاز، ذرا بات تو سنو۔''

''آیا امی جان!'' اعجاز یہ کہتا ہوا اندر کی طرف لپکا۔

مدثر، اعجاز کے جانے کے بعد دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اسے سخت آواز میں کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً یہ اعجاز کی امی جان کی آواز تھی۔ وہ اسے ڈانٹ رہی تھیں۔ ''تمہیں پڑھائی کا کچھ خیال نہیں، صبح سے ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہو، چلو ٹی وی بند کرو اور کتابیں لے کر بیٹھو۔''

''امی جان، میرا دوست آیا ہوا ہے۔''

''جانتی ہوں میں، اب اسے بھی رخصت کرو، جلدی کرو۔'' اعجاز کی امی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ مدثر حیرت سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی امی نے تو اسے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔

اعجاز کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''امی جان، وہ ابھی چلا جائے گا۔''

''بحث مت کیا کرو، جاؤ اسے رخصت کر کے پڑھنے کا موڈ بناؤ۔''

''امی جان!'' اعجاز کی رندھی ہوئی آواز ابھری۔ کچھ دیر اندر خاموشی رہی پھر اعجاز کی امی کی حیرت بھری آواز ابھری۔ ''ارے تمہاری آنکھوں میں آنسو؟ افوہ! شاید میں نے تمہیں زیادہ ڈانٹ دیا۔''

مدثر کو بہت حیرت ہوئی۔ اب ان کے لہجے میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔ اس کے بعد کی باتوں سے مدثر محسوس کرتا رہا کہ وہ اب اعجاز سے بہت پیار سے پیش آ رہی ہیں۔ یہ بات پہلی مرتبہ اس کے تجربے میں آئی تھی کہ ڈانٹنے کے بعد ماں کے پیار میں اس طرح کی مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ ''میری امی مجھے کیوں نہیں ڈانٹتیں، حالاں کہ میں نے انہیں کئی مرتبہ ستایا ہے۔''

اتنی دیر میں اعجاز اندر داخل ہوا۔ اس نے منہ دھو لیا تھا تا کہ رونے کا پتا نہ چل سکے۔ لیکن بھیگی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی یہاں بہت برسات ہوئی ہے۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ مدثر ان کی باتیں سن چکا ہے۔ وہ ٹی وی دیکھنے کے لیے بیٹھا تو مدثر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا یار، میں اب چلتا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔''

اعجاز نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ اصرار کر کے وہاں سے نکل آیا۔

مدثر اپنے ماں باپ کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے سب ہی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے ابو کاروبار کے سلسلے میں اکثر ملک سے باہر رہتے تھے۔ اس لیے مدثر کی تمام تر ذمہ داری اس کی امی پر تھی۔ اسے اپنی امی جان بہت پیاری لگتی تھیں۔ لیکن اب اعجاز کے گھر سے آنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ کچھ کمی سی ہے۔ آدمی مسلسل میٹھا کھانا کھائے تو دل چاہتا ہے کہ کوئی نمکین چیز کھانے کو ملے۔ ماں کے میٹھے میٹھے پیار کے ساتھ نمکین سی ڈانٹ بھی کھانے کو ملے تو بڑا مزا آئے۔ مدثر سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا کیا طریقہ ہو کہ اس کی امی اسے ڈانٹیں۔ بہت سوچ کر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اس تصویر کے سامنے کھڑا تھا جو اس کے امی ابو نے شادی کے بعد کھنچوائی تھی۔ شیشے کے فریم میں لگی وہ تصویر بہت پیاری تھی اور امی جان کو تو زیادہ ہی عزیز تھی۔ تب ہی صفائی والی ملازمہ کو حکم تھا کہ وہ یہ تصویر خود صاف کیا کریں گی۔ مدثر نے سوچا۔ ''یہ تصویر ضائع ہونے سے انہیں بہت دکھ ہوگا۔ وہ اسے ضرور ڈانٹیں گی بلکہ شاید وہ اسے ایک آدھ تھپڑ بھی لگا دیں۔''

مدثر نے تصویر اٹھائی اور بہت زور سے پختہ فرش پر دے ماری۔ چھناکے کی آواز ابھری اور اس کی امی دوڑتی ہوئی آئیں۔ ''کیا ہوا؟'' آتے ہی ان کے منہ سے یہ فقرہ نکلا۔ پھر ان کی نظر تصویر کے ٹوٹے ہوئے فریم پر پڑی۔ ان کے چہرے پر حیرت اور دکھ کا تاثر ابھرا۔ پھر فوراً ہی وہ تشویش زدہ لہجے میں مدثر کی طرف لپکیں۔ ''تم ٹھیک تو ہو بیٹے، کہیں شیشہ تو نہیں لگا۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگیں۔ انہوں نے بالکل نہیں پوچھا کہ تصویر کیسے ٹوٹی۔ مدثر کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ''یہ امی بھی عجیب ہیں...... کہاں یہ کسی کو بھی تصویر کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں اور کہاں اب اس کے برے حشر پر مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ شاید تصویر سے انہیں اتنا زیادہ پیار نہیں تھا'' مدثر نے سوچا۔

''کوئی بات نہیں، مجھے کچھ اور طریقہ سوچنا چاہیے'' مدثر نے خود سے کہا۔

چناں چہ اگلے دن وہ اپنا کتابوں کا بستہ گندے نالے میں پھینک آیا۔

''تمہارا بستہ کہاں ہے؟'' اس کی امی نے حیرانی سے اس کے خالی کندھوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ...... وہ امی...... وہ تو نالے میں گر گیا؟''

''نالے میں گر گیا......'' امی جان نے حیرت سے دہرایا۔ ''کیسے!'' انہوں نے سوال کیا مگر پھر خود ہی بولیں۔ ''شاید تم پھسل گئے ہو گے، چلو شکر ہے تم تو بچ گئے۔ بستے کا کیا ہے بستہ اور آ جائے گا۔ لیکن دیکھو آئندہ نالے سے دور سے گزرنا۔'' انہوں نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''امی جان......'' مدثر جھنجھلا گیا۔ ''کیا فائدہ ہوا بستہ پھینکنے کا، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! شاید امی کو ڈانٹنا ہی نہیں آتا۔'' مدثر نے سوچا۔ ''انہیں کسی بہانے سے اعجاز کے گھر لے جانا چاہیے تا کہ یہ سیکھ لیں کہ ڈانٹا کیسے جاتا ہے۔''

اگلے دن اس نے لان کے سارے پودے اکھاڑ ڈالے۔ پورے لان میں پھولوں کے رنگ برنگے پودے اپنی جڑوں سے اکھڑے پڑے تھے۔ اب کے وہ خود بھی مٹی میں لتھڑا وہیں بیٹھا رہا۔ بالآخر اس کی امی آ گئیں۔ پودوں کا حشر دیکھ کر ایک مرتبہ تو ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ مدثر نے دل میں کہا۔ ''وہ مارا، یہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ اب امی کا موڈ آف ہو گا۔''

''مدثر!'' امی نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔
مدثر ڈانٹ کھانے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگیا۔
''مدثر بیٹے، یہ تمہیں باغبانی کا شوق کب سے ہوگیا؟'' اس کی امی جان نے بڑے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا تو مدثر کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ اسے حیرت ہوئی، اتنا خوب صورت لان اس نے برباد کردیا اور وہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آرہی تھیں۔
''تم یہاں کچھ اور پودے لگانا چاہتے ہو؟'' اس کی امی بولیں۔
''نن...... نہیں امی۔'' مدثر گھبرا گیا۔ لیکن پھر دل میں آواز ابھری ''موقع مت گنواؤ۔''
''بس یہ پودے مجھے اچھے نہیں لگے، میں نے اکھاڑ دیئے۔''
وہ مسکرا دیں۔ ''اب تم بڑے ہو رہے ہو، چیزوں کو پسند اور ناپسند تو کرو گے ہی، چلو تم یہاں اب مالی بابا سے کہہ کر اپنی مرضی کے پودے لگوا لینا۔ لیکن اب تم اندر آجاؤ، کپڑے بدل لو۔'' اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئیں۔
مدثر سوچ میں پڑ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ معاملہ تو کسی طرح بھی نہیں بن پا رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنی امی بہت بری لگیں۔ ''ڈانٹ کھانا میرا حق ہے۔ وہ مجھے کیوں اس سے محروم رکھ رہی ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ اسے اپنی اس سوچ پہ حیرت بھی ہوئی کہ وہ اتنا پیار کرنے والی امی کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا۔ لوگ تو پیار کے لیے ترستے ہیں مگر وہ ڈانٹ کھانے کے لیے ترس رہا تھا۔ لیکن اب اس کے ذہن میں کوئی اور ترکیب نہیں آرہی تھی۔ اس لیے اس نے سوچنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔
اگلے دن جب وہ اسکول سے واپس آیا تو ذہن میں ایک اور منصوبہ تیار تھا۔ اس نے آتے ہی لاپرواہی سے بستہ ایک طرف پھینکا، بوٹ کا ایک پاؤں ایک کونے میں اور دوسرا دوسرے کونے میں دے مارا، منہ ہاتھ دھوئے بغیر کھانے کی میز پر بیٹھا، ابھی اس کی امی نے کھانا لا کر رکھا ہی تھا کہ وہ پلیٹوں کو پٹخ کر اٹھ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر منہ سر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ اس نے اس سارے عمل کے دوران میں اپنی امی کی طرف بالکل نہیں دیکھا تھا۔ ایسا اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ اس نے لیٹتے ہی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس نے اپنی امی کا دل زیادہ ہی دکھا دیا ہے۔ اب وہ اسے ضرور برا بھلا کہیں گی۔ اب وہ اس انتظار میں تھا کہ وہ اندر آئیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ابھری۔
''یہ انہی کے قدموں کی آواز ہے۔'' اس نے پہچان کر سوچا۔ اس کی امی اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھیں اور دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔
''یہ کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے مایوسی سے سوچا۔ اچانک اس کے چہرے پر گرم گرم پانی کے قطرے گرے۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی امی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس کے آنکھیں کھولتے ہی انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''مدثر بیٹے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''
اس لمحے ان کی آنکھوں کے آنسو دیکھ کر مدثر کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے، یا اس پر آسمان ہی ٹوٹ گرے۔ ان کی آنکھوں کے آنسو اس کے دل میں گرم سلاخوں کی طرح اترتے چلے جا رہے تھے اور اس کا دل اس دکھ سے پگھلا جا رہا تھا کہ اس نے اتنا زیادہ پیار کرنے والی ماں کو کتنا ستایا، محض معمولی اور فضول سی خواہش کے لیے، ایسی خواہش جو شاید دنیا کے کسی بھی بچے نے نہ کی ہوگی۔ اب وہ جان گیا تھا کہ ماں کی محبت لامحدود ہوتی ہے۔ کوئی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کی محبت کی آزمائش کی جاسکتی ہے۔ بے شک ماں کی ممتا ہر آزمائش میں پورا اترتی ہے۔

☆☆☆

قیمتی معلومات

- ☆ شہد کی مکھی کی 9 آنکھیں ہوتی ہیں۔
- ☆ مکڑی بیک وقت 1600 انڈے دیتی ہے۔
- ☆ ''یاک'' کے دودھ کا رنگ گلابی ہوتا ہے۔
- ☆ گھوڑے کے 40 دانت ہوتے ہیں۔
- ☆ آسٹریلوی بکرے مچھلیاں کھاتے ہیں اور درختوں پر بھی چڑھ جاتے ہیں۔
- ☆ بلجیم میں ننگے پاؤں چلنا جرم ہے۔
- ☆ سویڈن کا 55 فی صد رقبہ جنگلات پر مشتمل ہے۔
- ☆ تمام جانوروں میں سب سے بڑا دل زرافہ کا ہوتا ہے۔
- ☆ ہندوستان کا بادشاہ قطب الدین ''پولو'' کھیلتے ہوئے فوت ہوا تھا۔

(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/اپریل 2017ء ہے۔

مارچ 2017ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی **500** روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں — سو جاؤ تو کیا جاگ جاؤ تو کیا (بشریٰ صفدر، تلہ گنگ)
- سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے (فاطمہ فیصل، بہاول پور)
- نادان دوست سے عقل مند دشمن بہتر ہے۔ (محمد صفی الرحمٰن، لاہور)
- ایک کا مذاق دوسرے کا برا حال (نائمہ تحریم، کراچی)
- مچھر ختم کرتے کرتے مریض اذیت سے ادھ موا نہ ہو جائے (مطیع الرحمٰن، لاہور)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

وفادار

وقار عثمان

وہ سردی سے بری طرح ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کا ٹھکانا ایک نالے کے پہلو میں بنا ہوا بڑا سا سوراخ تھا۔ ایک حادثے میں وہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں رہا۔ جہاں اسے رہنے کی جگہ ملی ادھر ہی اس نے اپنا مسکن بنا لیا۔ چند دن قبل اسے نالے کے پہلو میں ایک بڑا سا سوراخ ملا تو شدید سردی میں اسے وہاں بہت سکون محسوس ہوا۔ یہ سوراخ زیادہ کشادہ تھا، نہ زیادہ تنگ تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے یہ جگہ بڑی بہترین تھی۔ وہ دن اور رات کا اکثر حصہ یہاں گزارنے لگا۔

ایک رات اچانک موسم خراب ہوگیا۔ آسمان پر بادل زور زور سے گرجنے لگے اور بجلی چمکنے لگی۔ یہ منظر اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا، اس لیے وہ ڈر کے مارے سہم کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بارش بھی برسنا شروع ہوگئی۔ بارش سے ٹھنڈ مزید بڑھنے لگی۔ اگر معاملہ صرف ٹھنڈ تک محدود رہتا تو قابل برداشت تھا، لیکن بارش سے نالے کا پانی بھی بڑھنے لگا تھا۔ پانی بڑھتے بڑھتے سوراخ میں داخل ہونے لگا۔ اب اس کے لیے سوراخ کے اندر ٹھہرنا ناممکن ہوگیا تھا۔

اس لیے وہ مجبوراً سوراخ سے باہر نکل آیا۔ اسے اب بارش سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ کہیں بھی جانے کے لیے اس کو سب سے پہلے نالے کی چڑھائی عبور کرنی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے گرتے پڑتے نالے کی چڑھائی عبور کی۔ سردی سے اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا رخ اب سامنے بستی کی طرف تھا۔ وہ چلتے چلتے بستی کے قریب پہنچ گیا، لیکن اس کا جسم سردی سے اکڑنے لگا تھا۔ بارش کی شدت میں کمی آ رہی تھی، لیکن سردی جوں کی توں برقرار تھی۔ ٹھٹھرتے جسم کے ساتھ مزید چلنا اس کے لیے دشوار ہو چکا تھا۔ وہ کئی ایک دروازوں کی طرف منہ کر کے زور سے چلایا، لیکن اس کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلا۔ اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ آخر وہ سردی سے بے حال ہو کر ایک دروازے کے سامنے گر پڑا۔ موت اسے اپنے قریب آتی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا چکا تھا۔

☆

رات کا آخری پہر تھا۔ اشرف چاچا دبے پاؤں اٹھا اور بڑی

احتیاط سے پاؤں اٹھاتا ہوا وضو خانے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس وقت اٹھتے ہوئے بڑی احتیاط برتتا تھا، تاکہ گھر میں موجود سوئے ہوئے افراد کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ وضو کے بعد اس نے مصلیٰ بچھایا اور رب کے حضور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ سردی ہو یا گرمی، صحت ہو یا مرض اشرف چاچا کے تہجد پڑھنے کے معمول میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا کہ اسے گلی سے چلانے کی پست سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز کتے کے پلّے کی تھی۔ اس کی آواز سن کر اشرف چاچا فکر مند ہو گیا کہ وہ برستی بارش اور شدید ٹھنڈ میں گلی میں کیوں ہے۔ وہ اس خیال سے بیٹھا رہا کہ شاید وہ کسی کا پالتو جانور ہو اور اس کا مالک اسے اپنے گھر لے جائے۔

اچانک وہ پست آواز آنا بھی بند ہو گئی تو اشرف چاچا پلّے کو دیکھنے کے لیے باہر نکلا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے سامنے کتے کا پلّا زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ٹھنڈ سے اس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ اشرف چاچا نے جلدی سے اسے اٹھایا اور گھر کے اندر لے آیا۔ اسے برآمدے میں رکھ کر اس کے پاس آگ جلائی۔ آگ کی تپش سے اس کا بدن گرم ہونے لگا۔ جلد ہی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب اس کے جسم میں جان پڑ چکی تھی۔ اشرف چاچا نے اسے ایک ٹوکرے کے نیچے بند کر کے اوپر ایک گرم بوری ڈال دی، تاکہ وہ ٹھنڈ سے محفوظ رہے۔

جب دن چڑھا اور سورج کی تیز دھوپ ہر طرف پھیل گئی تو اشرف چاچا نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ کافی دیر بعد اس کا بیٹا گھر سے باہر کسی کام کے لیے نکلا تو اس نے دیکھا کہ کتے کا پلّا کہیں اور جانے کے بجائے ابھی تک دروازے کے باہر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے دم ہلائی۔ بیٹے نے اندر آ کر باپ کو اطلاع دی کہ پلّا تو ابھی تک دروازے کے باہر ہی بیٹھا ہے۔ باپ نے اسے کہیں دور چھوڑ کر آنے کا حکم دیا۔ بیٹا اسے ایک دور مقام پر چھوڑ آیا۔ یہ ترکیب بھی دھری کی دھری رہ گئی جب پلّا شام کو پھر گھر کے دروازے پر پایا گیا۔ شاید اسے اب اس دروازے سے بھی محبت ہو چکی تھی۔ وہ اس دروازے کو کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں تھا، کیوں کہ وہ اشرف چاچا کے احسان کی زنجیر میں جکڑا جا چکا تھا۔ وہ اپنی وفادار فطرت سے مجبور تھا، اس لیے وہ اپنی زندگی اشرف چاچا کی غلامی میں بسر کرنے کا عزم کر چکا تھا۔

ادھر اشرف چاچا نیکی کر کے دریا میں ڈال چکا تھا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ جس کو وہ گھر سے باہر نکال رہا ہے وہ اس کے احسان کے بدلے اپنی ساری زندگی اس کی غلامی میں دینا چاہتا ہے۔ اس نے بیٹے کو بھیج کر اپنے ایک دوست کو بلوایا۔ اس کے پاس کثیر تعداد میں بھیڑ اور بکریاں موجود تھیں۔ اشرف چاچا نے اسے کہا۔

''اس کو رکھ لو۔ ذرا بڑا ہو کر تمہاری بھیڑ اور بکریوں کی حفاظت کرے گا۔ اس کو گھر میں باندھ کر رکھنا، تاکہ یہ وہاں رہنے کا عادی ہو جائے اور میرے گھر واپس نہ لوٹے۔''

اب اس کے شب و روز ایک لکڑی سے بندھے ہوئے گزرنے لگے۔ وقت کی گردش سے اب گرم موسم شروع ہو چکا تھا، لیکن اب بھی تک اس کو اپنا محسن اشرف چاچا نہیں بھولا تھا جس کی وجہ سے اسے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ وہ سرد رات جب بھی اس کو یاد آتی وہ سوچتا کہ اگر چاچا اشرف اس رات مجھے اپنے گھر لا کر سردی سے نہ بچاتے تو آج میں شاید زندہ نہ ہوتا۔ آج جب وہ جوان ہو چکا تھا تو اس کے مالک نے اس خیال سے اسے رسیوں سے آزاد کر دیا کہ وہ اب اشرف چاچا کو بھول چکا ہو گا۔

دوپہر کو کتے نے گھر کا دروازہ کھلا پایا تو بھاگ نکلا۔ وہ سیدھا اشرف چاچا کے گھر کی طرف گیا۔ جوں ہی اسے چاچا کے گھر کا دروازہ نظر آیا تو وہ خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا، تاکہ وہ کھل جائے، لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب اس نے دروازے کے نیچے سے اندر جانے کی کوشش کی۔ کوشش کے باوجود اس کا سر بھی پوری طرح داخل نہ ہو سکا۔ البتہ اسے گھر کے اندر صحن کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک چارپائی پر اشرف چاچا اور دوسری پر اس کا بیٹا سو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اچانک کتے نے دروازے کے نیچے سے سر نکالا اور زور زور سے بھونکتے ہوئے دروازے کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ شور سے اشرف چاچا کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کتے کی اس حرکت پر شدید غصہ آیا۔ اس نے اسے بھگانے کے لیے ایک ڈنڈا اٹھایا۔ جب وہ دروازہ کھولنے لگا تو ساتھ ہی دوسرا ہاتھ ڈنڈا مارنے کے

لیے اوپر اٹھا چکے تھے۔ جوں ہی دروازہ کھلا اِدھر کتا اندر کی طرف بڑھا۔ اُدھر اشرف چاچا کا ڈنڈا حرکت میں آیا۔ ڈنڈا کتے کی کمر کی بجائے سیدھا زمین پر جا لگا، کیوں کہ کتا ایک ہی چھلانگ میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ کتے کو بیٹے کی طرف بڑھتا دیکھ کر اشرف چاچا بھی اس کے پیچھے اس کو مارنے کے لیے دوڑا۔ اس شور سے بیٹے کی بھی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا ایک کتا اس کی طرف دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ وہ کتے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چیخا۔ اسے لگا کتا اس پر حملے کرنے کے لیے آرہا ہے۔ اتنے میں باپ کی چیختی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''بیٹا...... ! بچو...... بچو......''

اشرف چاچا کا ڈنڈا ایک بار پھر ہوا میں اٹھا ہی تھا کہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے ان کے ڈنڈے کا رخ بدل چکا تھا۔ ایک سانپ چارپائی کے ایک پائے سے لپٹے ہوئے اوپر اس کے بیٹے کے پاس پہنچ کر اس کے پاؤں پر کاٹنے ہی والا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کاٹ لیتا، کتے نے اسے اپنے دانتوں میں دبا کر دور پھینکا۔ اشرف چاچا کا ڈنڈا کتے کے بجائے اب سانپ کے سر پر برس رہا تھا۔ بیٹا سانپ کو دیکھتے ہی ڈر کے مارے دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ سانپ مارنے کے بعد اشرف چاچا نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ بیٹے کو سلامت پا کر خوشی کے مارے باپ کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ کتا بھی ان کے قدموں میں سر رکھ کر دم ہلا رہا تھا۔ کتے کو پہچاننے میں اسے ذرا دیر نہیں لگی تھی۔ آج اشرف چاچا کو اس سرد رات میں کتے سے کی ہوئی ہمدردی یاد آرہی تھی۔ اسی ہمدردی کی بدولت آج وہ اپنے بیٹے کو سلامت دیکھ رہا تھا۔

''بیٹا...... ! اینٹیں لاؤ......'' اس نے بیٹے کو حکم دیا۔

اشرف چاچا کتے کا گھر بنا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو دروازے پر وہی دوست موجود تھا جس کو اس نے کتا دیا تھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنے عرصے بعد بھی آپ کے گھر کا رخ کر لے گا، میں نے اس کو رسی سے آزاد کر دیا تھا۔''

''آپ اس سے بے فکر ہو جائیں۔ یہ اب اسی گھر میں رہے گا......'' اشرف چاچا اتنا کہہ کر پھر سے کتے کا گھر بنانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

مراد علی ایک پرائیویٹ کمپنی میں بطور انجینئر ملازمت کرتے ہیں۔ احمد اُن کا بیٹا جس کی عمر دس سال ہے اور وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے احمد سب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اس سال احمد پہلی پوزیشن حاصل کر کے پانچویں جماعت میں ہوگیا تھا۔ احمد کی لاجواب کام یابی پر مراد علی بہت خوش ہوئے اور احمد کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

”احمد! بیٹا محنت ولگن کے ساتھ پڑھائی کر کے شاندار کام یابی حاصل کرنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم بطور انعام جو چیز بھی مانگو میں لے کر دینے کو تیار ہوں۔“

”ابو جان مجھے نئی سائیکل لے دیں۔ میں اسکول سے آکر ہوم ورک سے فارغ ہوکر اس سائیکل سے کھیلا کروں گا۔ باپ کی طرف سے ملنے والی آفر پر احمد جھٹ سے بول اٹھا تھا۔

مراد علی نے احمد کی کام یابی کی خوشی میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ احمد اپنی سائیکل کے ساتھ کھیل رہا تھا اور کھیلتے کھیلتے وہ گلی میں نکل گیا۔ مراد علی دعوت میں مہمانوں کی خاطر تواضع میں مشغول تھے۔ احمد کی طرف اس کا دھیان نہیں رہا تھا۔ کھانا لگ چکا تھا اور سب مہمان کھانا شروع کر چکے تھے۔ مراد علی کے فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ مراد علی نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا جو کہ اس کی فون لسٹ میں موجود نہ تھا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ آخر کار مراد علی کو کال سننا ہی پڑی۔ جوں ہی مراد علی نے کال سننے کے لیے بٹن دبا کر موبائل کان کو لگایا اس کا چہرہ زرد ہوگیا اور دھڑام سے گر پڑا۔ دوستوں نے مراد علی کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں مراد علی بے ہوش ہو چکا تھا۔ مراد علی کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ ارشد نے مراد کے موبائل سے نمبر نکال کر واپسی کال کر کے معلومات لینے کی کوشش کی مگر تب تک نمبر بند ہو چکا تھا۔ بار بار کال ملانے کے باوجود کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔ اتنی دیر میں احمد گھر واپس آگیا تھا۔ مراد علی کو اسپتال لے جایا گیا۔ مراد علی کو دو گھنٹے بعد ہوش آیا تو احمد کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر فوراً گلے لگا لیا تھا۔ ”میرا بیٹا کیسا ہے...... تجھے کیا ہوا...... تجھے کچھ نہیں ہوگا...... تجھے کوئی بھی مجھ سے جدا نہیں کر سکتا......“ مراد علی یہ الفاظ بولتا جا رہا تھا اور بار بار احمد کا ماتھا چوم کر اسے سینے سے لگا رہا تھا۔ احمد کے دادا جان بولے: ”مراد بیٹا! احمد اپنی نئی سائیکل کو لیے گلی میں ہی کھیل رہا تھا۔ ابو کو بتاؤ احمد بیٹا......“ دادا جان نے احمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ابو جی میں تو گھر کے قریب ہی کھیل رہا تھا...... میں بالکل ٹھیک ہوں مگر آپ کو کیا ہوا؟ احمد نے دادا جان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے اپنے ابو جان سے سوال کیا۔

”احمد! بیٹا ایک نامعلوم نمبر سے فون آیا تھا۔ پہلے تو میں نے نظر انداز کر دیا تھا مگر بار بار کال آنے کی وجہ سے مجھے بات کرنا ہی

پڑی۔ میرے السلام علیکم کہنے کے بعد وہ کچھ یوں بول رہا تھا۔

''مراد بھائی جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں...... احمد کو ایک کار نے کچل دیا ہے اس کی حالت بہت خراب ہے...... وہ سڑک پر سائیکل لیے پھر رہا تھا کہ ایک تیز رفتار کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے...... جلدی سے اسپتال پہنچ جائیں...... میں اتنا گھبرا گیا تھا کہ میں نے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی کو کچھ بتا پایا۔ مراد علی نے بتایا۔

ڈاکٹروں نے مراد علی کا چیک اپ کرنے کے بعد چھٹی دے دی تھی۔ احمد کے دادا جان اور مراد علی کے دوست اسے گھر لے کر جانے کی تیاری کر رہے تھے مگر مراد علی کسی سوچ میں گم تھا۔

''تمہارا دھیان کدھر ہے؟'' دادا جان نے مراد علی کی عدم توجہ پر اسے ہاتھ سے ہلا کر کہا۔

''ابا جان میں...... میں سوچ رہا تھا کہ ایسا دشمن کون ہو سکتا ہے جو احمد کو مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے؟ اس معصوم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟'' مراد علی مسلسل اس نامعلوم نمبر پر کال کیے جا رہا تھا مگر وہ نمبر بند جا رہا تھا۔

دادا جان نے کہا کہ بیٹا پہلے گھر چلتے ہیں پھر اس نامعلوم نمبر اور کال کرنے والے شخص کے بارے میں سوچیں گے۔

وہ اسپتال سے گھر پہنچے ہی تھے کہ اتنے میں مراد علی کا ایک پرانا دوست اکرم بھی اس کے گھر آ گیا تھا۔

''ہاہاہاہاہاہا...... اپریل فول...... اپریل فول ...... اچھے بھلے انجینئر کو بے وقوف بنا دیا۔'' اکرم اپریل فول اپریل فول کہتا ہوا زور زور سے ہنس رہا تھا اور مراد علی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

''آپ کو شاید یاد نہیں کہ آج یکم اپریل ہے یعنی اپریل فول۔ آج کے دن جھوٹ بول کر لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ میں نے فون کر کے ایکسیڈنٹ کا جھوٹ بولا تھا۔'' اکرم بڑے فخر کے ساتھ اپنا کارنامہ بیان کرتا جا رہا تھا۔ اکرم کی باتیں سن کر احمد کے دادا جان نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اپریل فول کی حقیقت کا علم ہے؟

اکرم نے جواب دیا ''نہیں انکل! بس اتنا پتا ہے کہ اس دن جھوٹ بول کر لوگوں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔'' احمد کے دادا جان اکرم کا جواب سن کر اس سے گویا ہوئے۔

''اکرم بیٹا! اس طرح کے بے شمار واقعات اس دن سننے میں آتے ہیں اور بعض اوقات اچانک دردناک خبر سن کر انسان بے ہوش ہو جاتا ہے اور اگر صدمہ شدید ہو تو انسان جان کی بازی بھی ہار جاتا ہے۔

اکرم بیٹا، عیسائیوں نے سپین فتح کرنے کے بعد مسلمانوں کا بہت خون بہایا تھا اور مسلمان بادشاہ کو ملک بدر کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں جو چند مسلمان زندہ بچ گئے تھے وہ اپنی شناخت چھپا کر زندگی کے بقیہ دن پورے کر رہے تھے۔ عیسائیوں کی جانب سے مارچ کے مہینے میں بار بار اعلانات کیے گئے تھے کہ تمام مسلمان یکم اپریل کو غرناطہ میں جمع ہو جائیں۔ تمام مسلمانوں کو ان کی مرضی کے مطابق دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جائے گا اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چوں کہ امن قائم ہو چکا تھا اور عیسائیوں کی جانب سے حفظ و امان کی یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی لہٰذا تمام بچے کھچے مسلمان یکم اپریل کو غرناطہ میں جمع ہو گئے تھے۔ غرناطہ میں حکومت کی جانب سے مسلمانوں کی خوب خاطر کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ سمندر میں جہاز تیار ہیں سب مسلمان وہاں چلے جائیں۔

وطن چھوڑنے کا دکھ ہونے کے باوجود مسلمان خوش تھے کہ کم از کم جان تو بچ جائے گی۔ تمام مسلمان مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان جہازوں میں سوار ہو گئے تھے، انہوں کتابیں بھی ساتھ رکھ لی تھیں۔ جب مسلمان سمندر کے درمیان میں پہنچے تو منصوبے کے تحت گہرے سمندر میں ان کو کتابوں سمیت سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے خوب جشن منایا کیوں کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر قتل کر دیا گیا تھا اور اس دن کو First April Fool (یکم اپریل کے بے وقوف) کا نام دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے غیر مسلم ہر سال اس دن کو بڑے بھرپور انداز میں مناتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ کم علم مسلمان بھی یکم اپریل کو کسی تہوار کی طرح مناتے ہیں اور اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو جھوٹ بول کر دھوکہ دیتے ہیں اور خوشی مناتے ہیں۔ اکرم بیٹا تم نے بھی یہی کیا ہے۔ تمہارے اس مذاق کی وجہ سے مراد علی کی کیا حالت ہوئی ہے تم نہیں جانتے۔ بس یوں سمجھو کہ اللہ کریم نے اسے دوبارہ زندگی دی ہے۔ احمد کے دادا جان نے اکرم کو بتائی تو اکرم بہت شرمندہ ہوا۔ اس نے مراد علی سے معافی مانگی اور آئندہ ایسا مذاق کرنے سے توبہ کر لی۔

☆☆☆

دو دوست ایک کمرے میں سو رہے تھے، آدھی رات کے وقت ایک دوست بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا۔
دوسرے نے حیران ہو کر پوچھا: ''کیا بات ہے؟''
پہلے دوست نے جواب دیا: ''تم نے کل جو لطیفہ سنایا تھا وہ اب میری سمجھ میں آیا ہے۔''
(شائلہ ناز، میاں والی)

ایک شاگرد امتحان میں بیٹھا پرچہ دیکھ رہا تھا۔
استاد: ''کیوں بھئی کیا پرچہ مشکل ہے؟''
شاگرد: ''پرچہ مشکل بھی ہے، نہیں بھی۔ مگر میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سوال کا جواب میری کس جیب میں ہے۔''

☆

استاد: (شاگرد سے) ''بھائی چارہ لفظ کو جملے میں استعمال کرو۔''
شاگرد: ''ابو نے جب دودھ والے سے پوچھا کہ دودھ اتنا مہنگا کیوں ہے تو اس نے کہا بھائی، چارہ جو مہنگا ہو گیا ہے۔''
(حذیفہ اظہر، فیصل آباد)

مالک نوکر سے: ''مجھے صبح 4 بجے جگا دینا۔''
نوکر: ''لیکن صاحب، مجھے وقت دیکھنا نہیں آتا۔''
مالک: ''بس تم جگا دینا وقت میں خود دیکھ لوں گا۔''
(غزالہ حبیب، تاندلیانوالہ)

شاہد: ''کل میں بادشاہی مسجد کے مینار سے گر پڑا۔''
اسلم: ''تو بچ کس طرح گئے؟''
شاہد: ''معلوم نہیں، میری تو گرتے ہی آنکھ کھل گئی۔''

☆

ایک عورت دکان دار کو بچہ گاڑی کی آخری قسط ادا کر رہی تھی تو دکان دار نے پوچھا: ''محترمہ قسطیں تو پوری ہوگئیں بچے کا کیا حال ہے؟''
عورت: ''بچہ ٹھیک ٹھاک ہے یہ اس کی شادی کا دعوت نامہ ہے، آنا مت بھولیے گا۔''
(محمد عمر، حمزہ عثمان، چونیاں)

پہلا دوست: ''یار! اللہ نے مجھے دو نعمتیں عطا کی ہیں۔''
دوسرا دوست: ''کون کون سی؟''
پہلا دوست: ''ایک تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حافظہ بہت تیز دیا ہے اور دوسری مجھے یاد نہیں۔''
(عائشہ مریم، چونیاں)

گاہک (دکان دار سے): ''بھائی صاحب کیا یہ ٹماٹر تازہ ہیں؟''
دکان دار: ''جی بالکل تازہ ہیں، اس لیے دس دن سے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں۔''
(سعد مظہر)

ایک دوست (دوسرے دوست سے) ''کاش میں وقت ہوتا، لوگ میری قدر کرتے۔ ہر شخص میرا غلام ہوتا۔ لوگ میرے پیچھے بھاگتے لیکن میں کسی کے ہاتھ نہ آتا۔''
دوسرا دوست: ''اگر تم وقت ہوتے تو لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتے۔''
''پہلا دوست: وہ کیوں؟''
دوسرا دوست: لوگ کہتے۔ ''بھائی ہٹ جاؤ، کتنا برا وقت آ رہا ہے۔''
(احور کامران، لاہور)

ایک مولوی صاحب نے دکان داروں کے سامنے وعظ کے دوران پوچھا۔ ''بتاؤ دنیاوی خوشی کی قیمت کیا ہوتی ہے؟'' ایک دکان دار جسے نیند آ گئی تھی، چونک کر بولا۔ ''چالیس روپے درجن۔''

☆

ایک انگریز نے پاکستانی سے کہا۔ ''تمہارے ملک میں کالے، بھورے، سانولے، گندمی رنگ کے لوگ ہیں جب کہ ہمارے ملک میں سب لوگ گورے ہوتے ہیں۔'' پاکستانی نے مسکرا کر کہا۔ ''گھوڑے ہر رنگ کے ہوتے ہیں جب کہ گدھے ایک ہی رنگ کے ہوتے ہیں۔''
(محمد عبداللہ آصف، چونیاں)

ارشد: ''کیوں زاہد! سورج کس طرف سے طلوع ہوتا ہے؟''
زاہد: (برا سا منہ بنا کر) ''یہ تو کسی بے وقوف سے بھی پوچھو گے تو بتا دے گا۔''
ارشد: ''اسی لیے تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔''
(ملیحہ نور، لاہور)

دُرفشِ کاویانی دو الفاظ کا مجموعہ یا مرکب ہے۔ دُرفشِ اور کاویانی...... دُرفشِ فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: پرچم، جھنڈا، نشان...... نیز وہ سہ گوشہ طلائی کام کیا کپڑا جو عموماً جھنڈے کے سرے پر لگایا جاتا ہے اور ہوا کے جھونکوں سے اڑتا اور لہراتا رہتا ہے۔ کاوہ یا گاوہ اصفہان کے ایک مشہور لوہار کا نام ہے جس نے اپنی چمڑے کی دھونکنی سے یہ جھنڈا بنایا تھا۔ تو ''دُرفشِ کاویانی'' کا مطلب ہوا...... وہ جھنڈا مع پھریرا جو کاوہ یا گاوہ لوہار نے بنایا تھا۔

آج سے تقریباً اڑھائی سال پہلے (چھٹی صدی قبل از مسیح میں) ایران میں جمشید بادشاہ کی حکومت تھی۔ ضحاک بن علوان نے جمشید کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ وہ فطری طور پر انتہائی ظالم، بے رحم اور عیاش تھا۔ اس کی عیاشی اور سفاکی کی وجہ سے اس کے دونوں کندھوں پر رسولی کی طرح گوشت کے دو لوتھڑے ابھر آئے جو آئے دن بڑھنے اور بدنما ہونے لگے۔ ضحاک نے انہیں کٹوا دیا مگر نتیجے میں وہ سخت درد میں مبتلا ہو گیا اور سب کے لیے مصیبت بن گیا۔ طبیبوں نے اس کے درد کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہے۔ بالآخر انہوں نے باہمی مشورے سے ایک ایسا مرہم تیار کیا، جس میں چربی کی جگہ کم از کم دو انسانوں کا بھیجا (مغز) ڈالا جاتا تھا۔ جب تک یہ مرہم لگا رہتا، اسے سکون ملتا...... جونہی مرہم خشک ہوتا، تکلیف دوبارہ شروع ہو جاتی۔ اس مرہم کے لیے پہلے تو ضحاک نے قیدیوں اور مجرموں کے دماغ نکلوائے پھر عام لوگوں کی باری آ گئی۔ ضحاک ہر محلے سے دو یا چار آدمی منگواتا اور انہیں قتل کروا کے مرہم کے لیے ان کا مغز نکلوا لیتا۔ اس طرح اس کا یہ موذی مرض خلقِ خدا کے لیے بھی عذاب بن گیا۔ قتل و غارت کا یہ شیطانی سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار اصفہان کا ایک لوہار ''کاوہ'' اس اندھے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، جس کے اپنے چار بیٹے اس شاہی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔

کاوہ لوہار نے اپنی دکان کو تالا لگایا اور جس چمڑے کو اہران (لوہے کا وہ چوکور ٹکڑا جس پر ہتھوڑے سے لوہار کوٹتے ہیں) کے نیچے بچھایا کرتا تھا، اس چمڑے کو ایک جھنڈا بنا کر ایک لکڑی پر لٹکا دیا اور ڈھول بجاتا، ضحاک کے ظلم و ستم کا راگ گاتا اصفہان کے گلی کوچوں میں گھومنے لگا۔ ظلم و جبر سے تنگ آئے ہوئے لوگ اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ سارا اصفہان اس کے ساتھ ہو گیا۔ اس جذبے اور یقین کے ساتھ کہ دُرفشِ کاویانی خدائی جھنڈا ہے، جو جہاد کی علامت بن گیا ہے۔ لوگوں کا اتفاق رنگ لایا اور سب سے پہلے اصفہان کے حاکم کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے شہروں اور قلعوں کی طرف پیش قدمی کی گئی اور ہر جگہ ضحاک کے لشکروں کو عبرت ناک شکست دی گئی۔ چمڑے کا پرچم مقدس نشان اور فتح کی علامت بن گیا۔ اس پر قیمتی اور چک دار زر و جواہر ٹانک کر اسے باقاعدہ ''دُرفشِ کاویانی'' کا نام دیا گیا۔ کاوہ لوہار جب ضحاک کی فوج کا صفایا کرتا ہوا ملک رے (عراق) پہنچا تو آخری فیصلہ کن جنگ سے پہلے صلاح مشورہ کیا گیا۔ سب لوگوں نے مشترکہ طور پر کاوہ لوہار کو اپنا بادشاہ چن لیا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے بادشاہ کے منصب سے کوئی غرض نہیں، اس کا صحیح حق دار فریدون پسر جمشید ہے۔ خوش قسمتی سے فریدون ان دنوں ملک رے (عراق) میں ہی

تھا۔ چناں چہ تاج پوشی کی باقاعدہ رسم منعقد ہوئی اور جمشید کے بیٹے فریدون کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ یوں فریدون بادشاہ کی قیادت میں آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس میں درندہ صفت بادشاہ ضحاک کو عبرت ناک شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔

کاوہ لوہار نے بیس برس تک فریدون کا ساتھ دیا۔ چین روم اور ترکستان کے علاقے فتح ہوئے۔ ان تمام جنگوں میں دُرفشِ کاویانی فوج کا جھنڈا بنا رہا اور تمام کامیابیاں اس جھنڈے کی برکت سمجھی گئیں۔ اس لیے مالِ غنیمت کا ایک حصہ اس پر چڑھا دیا جاتا۔ جب کاوہ لوہار وفات پا گیا تو فریدون بادشاہ نے یہ جھنڈا اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس نے اپنے عروج کو اس کی برکت جان کر نہایت بیش قیمت جواہرات سے اسے مزین کردیا۔ بلکہ اس پر ریشم بھی چڑھا دیا اور اسے باقاعدہ آئینی اور شاہی پرچم قرار دیا۔ وقت نے اس شاہی پرچم کو بڑی شان و شوکت عطا کی۔ دُرفشِ کاویانی کی اس قدر دھاک بیٹھ گئی کہ کسی بھی جنگ میں مخالف بادشاہ کثیر فوج رکھنے کے باوجود جب یہ دیکھتا اور سنتا کہ مقابل میں دُرفشِ کاویانی لہرا رہا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جاتا اور ہار مان لیتا۔ یہ جھنڈا ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کے زمانے تک فتح و کامرانی کی علامت بنا رہا۔ یہ اتنا بیش قیمت ہوگیا کہ اس زمانے کے جوہری اس کی قیمت کا اندازہ لگانے سے عاجز آگئے۔ جھنڈے کا چمڑا قیمتی جواہرات کے نیچے چھپ گیا اور بوسیدہ ہوگیا۔ تقریباً گیارہ صدیوں تک دُرفشِ کاویانی پوری آن بان کے ساتھ قائم رہا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں مجاہدینِ اسلام نے ایران فتح کیا تو دُرفشِ کاویانی بھی ہاتھ لگا۔ اسے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؓ نے دُرفشِ کاویانی کے تمام جواہرات مجاہدین میں بانٹ دیے، چمڑے کو جلا کر خاکستر کر دیا اور فرمایا۔ ''دیکھو، سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بھی چیز یہ طاقت نہیں رکھتی کہ انسان کی مدد اور حمایت کر سکے۔ لہٰذا جو شخص کاوہ لوہار کے جھنڈے پر ایمان اور یقین رکھے، اسے لوہار کے لوہے سے ہی قتل کر دیا جائے!''

☆☆☆

کھوج لگانیں میں حصہ لینے والوں کے نام

شیخ رافع احسان حمدی، ملتان۔ محمد بن خالد، لاہور۔ محمد اسد، کراچی۔ محمد حسین ماجد قادری، کاموکی۔ نور علی، ملتان۔ حافظ عفیفہ اشرف، لاہور۔ محمد قدیر قادری، محمد غضنفر قادری، محمد عبدالحمید قادری، محمد سیف الرحمٰن قادری، محمد حسن رضا سردار وصفی، عائشہ فاطمہ قادری، نفیسہ فاطمہ قادری، خدیجہ نشان، کاموکی۔ حاویہ جان، کھاریاں۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ مشعال آصف، لاہور۔ محمد ارحم معراج، وانیا معراج، سرگودھا۔ ریحان علی، محمد صفی الرحمٰن، مہر اکرم، بانیہ آصف، لاہور۔ میاں عبداللطیف، شیخوپورہ۔ مریم ملک ذوالفقار علی، گوجرانوالہ۔ محمد عثمان محمود، اوکاڑہ۔ طیبہ ذوالفقار، گوجرانوالہ۔ علینا اختر، کراچی۔ تحریم نور، گجرات۔ رومیا طاہر، میاں والی۔ سیدہ انیبہ صابر، ٹیکسلا۔ مبشرہ عمر، طلحہ قطب، لاہور۔ محمد حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ آیت شاہد، زہرہ فاطمہ، لاہور۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ کشمالہ رضوان، ملتان۔ عبدالرحمٰن قیصرانی، کراچی۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ معصومہ زہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مریم مصطفیٰ، رحیم یار خان۔ محمد اکرام قادری، کاموکی۔ فرحان علی، لاہور۔ تصور عباس، جوہر آباد۔ بشریٰ صفدر، تلہ گنگ۔ امامہ تجمل، کراچی۔ عُیینہ، واہ کینٹ۔ فرحین بی بی، اسلام آباد۔ محمد سعد، ماہین صباحت، لاہور۔ محمد کمیل وسیم، سعد رحمٰن، گوجرانوالہ۔ صدف آسیہ، کراچی۔ حذیفہ اظہر، فیصل آباد۔ عبدالرحمٰن عبدالباقی، رافعہ اویس، لاہور۔ عائشہ احمد، گجرات۔ علی عمران، خانیوال۔ محمد اویس رضا، منڈی بہاؤ الدین۔ حافظ محمد اقبال علی، رحیم یار خان۔ ریاض حسین، لاہور۔ محمد عزیز احمد، کراچی۔ صفدر نور، جہلم۔ جمال خالد، میر پور۔ کاشف صدیقی، گجرات۔ انمول جاوید، گوجرانوالہ۔ طارق فاروق، نارووال۔ محمد مزمل احسن، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ شرمین غنی، کراچی۔ ماہ رخ بتول، کوٹ رادھا کشن۔ رانا شان طفیل، سرگودھا۔ فاطمہ بی بی، حیدر آباد۔ نوشین خان، پشاور۔ احمد جمال، واہ کینٹ۔ عکاشہ نعمان، ملتان۔ عزیر محبوب، لاہور۔ ایمن مصطفیٰ، اسلام آباد۔ رضوان جاوید، بہاول پور۔ فردوس اشرف، سیال کوٹ۔ سائرہ خان، نوشہرہ۔ سندس عباسی، ایبٹ آباد۔ نور اکرام، فیصل آباد۔ صلاح الدین یوسف، ڈیرہ غازی خان۔ مریم نعیم، کراچی۔ محمد نعمان امجد خان، ٹانک۔ مرزا حامد بیگ، حیدر آباد۔ میاں محمد علی ارسلان، رحیم یار خان۔ یاسر خان، مردان۔ نوشین الیاس، راول پنڈی۔ سیف علی، کاموکی۔ ذوالفقار علی، گوجرانوالہ۔ ماجد ظہور، اٹک۔ اقبال علی، منڈی بہاؤ الدین۔ محمد منیر، میاں والی۔ محمد احمد، ڈیرہ اسماعیل خان۔☆☆

ایٹم کی کہانی

دوسری جنگ عظیم ختم ہونے والی تھی، ہٹلر کی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ جاپان کی فوجوں میں بھی بھگ دڑ مچی ہوئی تھی۔ انہوں نے برما، سیام، انڈونیشیا اور دوسرے علاقوں کو خالی کر دیا تھا اور ان کی ہار اب چند دنوں کی بات تھی۔ انہی دنوں اگست کی ایک روشن صبح کے وقت ایک امریکی ہوائی جہاز جاپان کی طرف اڑتا ہوا دیکھا گیا۔ ہوائی جہازوں نے ہیروشیما شہر کے پاس پہنچ کر ایک دو چکر لگائے۔ امریکی ہوا باز نے نیچے جھک کر دیکھا۔ شہر کی اونچی اونچی عمارتیں اسے صاف نظر آ رہی تھیں۔ سڑکوں پر موٹریں اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ریل گاڑی کے انجن دھواں اڑاتے گزر رہے تھے۔ چھتوں پر عورتیں کپڑے سکھا رہی تھیں۔ پارکوں میں بچے جھولا جھول رہے تھے۔ اس نے نیچے دیکھنا بند کر دیا۔ اب اس کا جہاز بہت بلندی پر اڑ رہا تھا اور جب وہ اتنا بلند ہو گیا کہ شہر کی چیزیں ہوا باز کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس نے ایک بٹن دبایا۔ فوراً بھورے رنگ کا ایک بم ہوائی جہاز کے پیٹ سے نکل پڑا۔ یہ بم ہیروشیما شہر پر گر رہا تھا۔ ہوا باز نے انجن کی رفتار بہت تیز کر دی۔ پل جھپکتے وہ ہیروشیما سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

ہوا باز نے رومال سے پسینہ پونچھا اور دوربین اٹھا کر ہیروشیما کا منظر دیکھنے لگا۔ ہیروشیما کا آسمان روشنی کی چمک سے لال ہو رہا تھا۔ دھوئیں کے کالے کالے بادلوں کی ایک ہیبت ناک چھتری جو پہاڑ سے بھی بڑی تھی آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی اور شہر میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم پھینکا گیا تھا۔

اس ایک ایٹم بم نے ہیروشیما کو جلا کر راکھ کر دیا۔ بم کا دھماکا اتنا زبردست تھا کہ بڑی بڑی عمارتیں کاغذ کے پرزے کی طرح ہوا میں بکھر گئیں اور گرمی اتنی شدید تھی کہ لوہے کے کارخانے پگھل کر پانی بن گئے۔ ساٹھ ہزار آدمی ہلاک اور ایک لاکھ زخمی ہوئے جو زندہ بچے انہوں نے ایٹم کے زہریلے اثر سے سسک سسک کر دم توڑا۔

مگر ایٹم بم میں اتنی زبردست طاقت کہاں سے آئی۔ یہ ایٹم کیا چیز ہے جس کی قوت کے آگے لوہا بھی پانی ہو جاتا ہے؟

ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں۔ ”جسے تقسیم نہ کیا جا سکے۔“ ایٹم کی اصطلاح اب سے ہزاروں برس پہلے یونان کے سائنس دان ڈیموکرائی ٹس نے بنائی تھی۔ ایٹم مادی چیزوں کا وہ چھوٹے چھوٹا ذرہ ہے جسے تقسیم نہ کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ تمہارے پاس لوہے کا ایک گولا ہے اور تم

اسے کسی تیز چاقو سے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہو۔ اس کا آخری ذرہ جسے تم کاٹ نہیں سکتے ایٹم کہلائے گا۔ ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن ایٹم کے بھی تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک پروٹان کہلاتا ہے، دوسرا نیوٹران اور تیسرا الیکٹران۔ پروٹان اور نیوٹران ایٹم کے مرکزی حصے کو کہتے ہیں اور الیکٹران وہ حصہ ہے جو اس مرکز کے گرد بڑی تیزی سے گھومتا ہے۔ یہ حصے آپس میں اتنی مضبوطی سے جڑے ہوتے کہ انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایٹم کے اندر بڑی طاقت ہوتی ہے۔

سائنس دانوں کو ایٹم کی یہ صفت معلوم ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اگر کسی طرح سے ایٹم کے حصے الگ کیے جا سکیں تو اس کی توانائی سے پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ چناں چہ کئی سائنس دانوں نے ایٹم کو توڑنے کا تجربہ شروع کر دیا۔ ان میں برطانیہ کے سائنس دان لارڈ روور فورڈ بہت مشہور ہیں انہوں نے کام یاب یورینیم نام کی ایک دھات پر تجربہ کیا۔ ان کا تجربہ کام یاب ہوا تو جرمنی کے مشہور سائنس دان آئن سٹائن نے ریاضی کے علم سے یہ انکشاف کیا کہ مادے کو توانائی میں بدلا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ایٹم کی توانائی کو کام میں لانے کے لیے یورپ اور امریکہ کے درجنوں سائنس دان تجربوں میں مصروف ہو گئے۔ ہٹلر نے جب جرمنی پر قبضہ کیا تو وہاں کے سائنس دانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایٹمی تجربے تیز کر دیں۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یورپ کے بہت سے سائنس دانوں نے ہٹلر کے ڈر سے بھاگ بھاگ کر امریکہ میں پناہ لے لی۔ آئن سٹائن جرمنی سے، ڈاکٹر فرنی اٹلی سے، پروفیسر زی لارڈ ہنگری سے، پروفیسر نیل بوہر سویڈن سے بھاگ کر امریکہ پہنچے۔ جب امریکی حکومت کو یہ پتا چلا کہ ہٹلر کے سائنس دان ایٹم بم بنانے میں مصروف ہیں تو اسے بڑی تشویش ہوئی۔ کیوں کہ ہٹلر ان ایٹمی بموں سے دنیا کا صفایا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چناں چہ امریکی حکومت نے یورپ سے آئے ہوئے سائنس دانوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں امریکہ کے چوٹی کے سائنس دان بھی شامل تھے۔ کانفرنس میں ایٹم بم بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

مگر ایٹمی طاقت کو توانائی میں بدلنا اور ایٹم کے حصوں کو الگ کرنا آسان کام نہ تھا۔ یہ کام ڈاکٹر فرنی نے جو اٹلی سے آئے تھے اپنے ذمے لیا۔ انہوں نے گریفائیٹ (جس سے پنسل بنتی ہے) اور یورینیم کی چھوٹی چھوٹی بہت سی سلیں بنوائیں اور تلے اوپر ان کو ڈھیر کر دیا اور ان کے اندر ایک دھات کی سلاخ رکھ دی۔ اس سلاخ کا کام یہ تھا کہ نیوٹران کو اپنے اندر جذب کر لے۔ جس طرح سوختہ سیاہی کو چوس لیتا ہے۔ اس سلاخ کو باہر نکالنے سے نیوٹران یورینیم کے ایٹم کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر فرنی کا یہ تجربہ دسمبر 1942ء میں آخر کار کام یاب ہو گیا۔

اب ایٹم بم تیار ہونے لگا۔ پہلے ایٹم بم کا تجربہ جولائی 1945ء میں امریکہ کے ایک ریگستان میں کیا گیا۔ یہ تجربہ بھی کام یاب رہا۔ تب اگست 1945ء میں ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم پھینکا گیا۔ یہ ایٹم بم عام بموں سے تیس ہزار گنا زیادہ طاقت ور تھا۔

مگر ایٹمی طاقت یعنی جوہری توانائی سے دنیا کو تباہ کرنے کا ہی کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس سے بہت سے مفید کام بھی لیے جا رہے ہیں۔ دوائیں بن رہی ہیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے سمندر کو صاف کیا جا رہا ہے۔ پانی کے جہاز ایٹمی طاقت سے چلائے جا رہے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے اندر راستے بنائے جا رہے ہیں۔

اگر دنیا کے بڑے بڑے ملک ایٹم بم بنانا ترک کر دیں اور ایٹمی طاقت کو انسان کی بھلائی کے کاموں میں صرف کرنے لگیں تو ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔ کارخانے، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھی ایٹمی طاقت سے چل سکتے ہیں۔ اس طرح ایندھن کا خرچ بچ سکتا ہے اور چیزیں سستی ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جوہری توانائی بہت سی دواؤں میں بھی کام آ سکتی ہے۔

☆☆☆

(بقیہ: درس و قرآن و حدیث)

جنت اپنے مکینوں کی طالب تھی اور جس سے خوشبو کے جھونکے اُٹھ رہے تھے اور جہنم اپنے باسیوں کو طلب کر رہی تھی اور اس سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پیارے بچو! ہمیں ایمان پر قائم رہتے ہوئے سچے دل کے ساتھ نیکیاں کرنی چاہئیں تا کہ ہم جنت میں جا سکیں اور اللہ کی نافرمانی اور گناہ ہرگز نہیں کرنے چاہئیں جو جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔

آپ بھی لکھیے

سنت کا طریقہ

(فاطمہ ارشد، اٹک)

''عدنان بیٹا خاموشی سے کھانا کھاؤ'' امی نے عدنان کو ٹوکا جو کھانا کھاتے دنیا کے نجانے کون سے قصے سنا رہا تھا۔

عدنان اپنے امی ابو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کا گھرانہ متوسط طبقے میں شمار ہوتا تھا۔ عدنان ویسے تو بہت اچھا لڑکا تھا لیکن اس میں ایک برائی تھی کہ کھانا کھاتے وقت خاموش نہیں رہتا تھا اور مزے کی بات کھانا کھاتے وقت ہی اسے تمام باتیں یاد آتیں۔ اس کے امی ابو دونوں نے بہت سمجھایا کہ بیٹا کھانا کھاتے وقت باتیں نہیں کرتے اور حدیث شریف میں بھی یہی ہے کہ ''کھانا خاموشی سے کھایا جائے اور ہاتھ منہ دھو کر کھایا جائے اور زمین پر بیٹھ کر کھایا جائے۔'' اس لیے کھانا خاموشی سے کھاؤ لیکن وہ عدنان ہی کیا جو بات مان لے۔

اگلے دن عدنان اسکول سے واپس آیا تو اس کے ابو آفس سے چھٹی لے کر آئے ہوئے تھے کیوں کہ عدنان نے ابو سے کہا تھا کہ ''وہ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔''

عدنان نے جب اپنے ابو کو کھانے کے لیے اس کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا تو بہت خوش ہوا اور جلدی جلدی یونیفارم اتار کر ہاتھ منہ دھو کر آ گیا اور امی ابو کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اپنے اسکول کے قصے سنانے لگا۔ امی نے عدنان کو ٹوکا۔ ''بیٹا کھانا خاموشی سے کھاؤ۔ کل آپ کو کیا سمجھایا تھا۔'' عدنان کچھ دیر کے لیے تو خاموش ہو گیا لیکن زیادہ دیر تک خاموش نہ رہ سکا اور دوبارہ باتیں شروع کر دیں۔ اس کی امی نے اپنی بات کا اثر نہ ہوتے دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

عدنان نے نوالہ منہ میں ڈالا اور بات کرنے کے لیے منہ کھولا۔ اس کے منہ کھولنے کی دیر تھی کہ نوالہ حلق میں جا پھنسا اور ایسا پھنسا کہ گلے کی ہڈی بن کر رہ گیا جسے نہ نگل سکتا تھا نہ اگل۔ عدنان کو سانس لینے میں تکلیف ہوئی اس نے پانی کی تلاش کے لیے نظر دوڑائی لیکن پانی دور پڑا تھا وہ چلایا:

''پپ...... پپ پانی..........''

امی نے گھبرا کر اسے دیکھا اور فوراً پانی کا گلاس اسے پکڑایا۔ ابو نے عدنان کی پیٹھ سہلائی۔ پانی پی کر اس کا نوالہ تو حلق سے اتر گیا لیکن اسے بہت کچھ سمجھ آ گیا تھا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ اسلام نے جو اصول بنا رکھے ہیں اگر انسان ان سب پر عمل کرے تو بہت بڑے نقصان سے بچ سکتا ہے اور اگر اس کا نوالہ اسی طرح حلق میں پھنسا رہ جاتا اور پانی نہ ملتا تو اس کا کیا ہوتا۔ وہ امی ابو کی امیدوں کا واحد سہارا تھا ان کا کیا ہوتا۔ اس نے اپنے امی ابو سے معافی مانگی جن کے سمجھانے پر بھی وہ نہ سمجھا تھا۔ اس نے آئندہ کھانا کھاتے وقت باتیں کرنے سے توبہ کر لی۔

رنگ برنگے چوزے

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

(مہک وقاص، صادق آباد)

ایک دفعہ ایک آدمی دکان دار کے پاس گیا۔ اس نے دکان دار سے انڈے مانگے۔ دکان دار نے اسے انڈے دے دیے اور کہا کہ ان میں سے جو چوزے نکلیں گے، وہ بہت جھگڑالو ہوں گے۔ وہ شخص بہت خوش ہوا اور انڈے لے جا کر مرغی کے ڈربے میں رکھ دیے۔ کچھ دنوں بعد انڈوں میں سے چوزے نکل آئے۔ دن گزرتے رہے، یہاں تک کہ چوزے بڑے ہو گئے لیکن اس شخص کو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ تو آپس میں جھگڑا نہیں کرتے۔ وہ دکان دار کے پاس گیا اور بولا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ یہ جھگڑالو ہوں گے لیکن یہ تو آپس میں جھگڑا نہیں کرتے، آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے۔ اب آپ میرے پیسے واپس کر دیں۔'' دکان دار نے وہ تمام مرغے اور مرغیاں اس سے لے لیں اور اسے اگلے دن آنے کا کہا۔

جب وہ آدمی اگلے دن آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ دکان دار نے تمام مرغے اور مرغیوں کو مختلف رنگوں میں رنگ دیا ہے اور وہ مختلف

پنجروں میں بند ہیں۔ جیسے ہی دکان دار نے انہیں پنجرے سے آزاد کیا تو وہ سب ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے اور لڑنے لگے۔

وہ شخص یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ گھر میں تو یہ نہیں لڑ رہے تھے لیکن اب یہ ایک دوسرے کی جان لینے پر تلے ہیں۔ اس نے دکان دار سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔ ''کل تک یہ ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے کیوں کہ یہ بچپن سے آپس میں رہ رہے تھے اور ایک جیسے تھے جب کہ آج میں نے ان کو مختلف رنگوں میں رنگ دیا تو یہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں رہے اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔''

پیارے بچو......! ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آج ہم مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں اس لیے آپس میں مل کر نہیں رہ رہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس فرق کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیں۔ ایک دوسرے کو غیر سمجھنا چھوڑ دیں اور پیار و محبت اور امن کی چادر اوڑھ کر ایک خاندان کے فرد کی حیثیت سے ایک دوسرے سے محبت کریں۔ اس میں ہم سب کا فائدہ ہے بلکہ پاکستان بھی ترقی کی جانب گامزن ہوگا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

(رامین زہرا، لاہور)

غفلت کا انجام

ثمر، عامر اور عروج بہن بھائی تھے۔ وہ چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ امی ابو بازار گئے ہوئے تھے۔ عامر کی باری تھی۔ عروج دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ چھت پر ان کی ایک پیٹی پڑی ہوئی تھی۔ ثمر نے سوچا کہ وہ اس پیٹی میں چھپ جائے۔ چناں چہ وہ اس پیٹی میں چھپ گیا۔ عامر نے دونوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس نے دروازے کے پیچھے دیکھا تو اسے عروج مل گئی۔ عامر نے کہا۔ ''چلو ہم دونوں مل کر ثمر کو ڈھونڈتے ہیں۔'' دونوں ثمر کو ڈھونڈنے لگے۔ چھت پر جو پیٹی تھی اس میں ثمر چھپا ہوا تھا، پیٹی کا ڈھکن بند ہوگیا اور ثمر کو خبر نہ ہوئی۔ وہ اندر ہی سو گیا۔ عامر اور عروج ثمر کو ڈھونڈتے رہے۔ آخر ان کے والدین بازار سے آگئے۔ عروج نے انہیں کہا کہ امی! ہم تینوں چھپن چھپائی کھیل رہے تھے۔ ثمر کہیں چھپ گیا ہے اور اب وہ ہمیں کہیں نہیں مل رہا۔ اب امی اور ابو بھی ثمر کو ڈھونڈنے لگے، انہوں نے بہت ڈھونڈا۔ آخر صبح سے شام ہوگئی لیکن ثمر کو نہیں ملنا تھا نہ ملا۔ گھر کے سب افراد پریشان ہوگئے۔ ابو نے مسجد میں اعلان کروایا، پولیس میں رپورٹ درج کروائی لیکن ثمر کا پتا نہ چل سکا۔ ان کے رشتہ دار بھی ان کے گھر پوچھنے آئے کہ ثمر کا کوئی سراغ ملا یا نہیں۔ سب نے ثمر کو ڈھونڈا لیکن پیٹی کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اسی حالت میں تین دن گزر گئے۔ اب تو امی، عروج اور عامر کو ایسے لپٹائے رکھتیں جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں چھپائے رکھتی ہے۔ ایک دن کام والی ماسی کپڑے دھونے کے لیے چھت پر گئی۔ واشنگ مشین کے پاس ہی پیٹی تھی۔ ماسی کو کچھ ناگوار سی بدبو آئی۔ ماسی نے عروج اور عامر کی خالہ کو آواز دی۔ اس وقت خالہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھیں۔ ماسی کی آواز سن کر وہ چھت پر گئیں۔ ماسی نے انہیں کہا کہ مجھے ناگوار سی بدبو آرہی ہے۔ خالہ کو بھی بدبو آئی۔ جب انہوں نے بدبو کا سراغ لگایا تو پتا چلا کہ بدبو پیٹی میں سے آرہی ہے۔ انہوں نے پیٹی کو کھول کر دیکھا تو ماسی اور خالہ کی چیخیں نکل گئیں۔ گھر والے چھت پر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ پیٹی میں ثمر کی لاش پڑی ہے۔ اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ گھر میں آہ و زاری شروع ہوگئی۔ آٹھ سالہ بچے کی میت گھر کے صحن میں رکھی گئی۔ ماں بے ہوش اور باپ زرد چہرے کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر کسی کے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ آخر کیوں اتنی غفلت اور لاپرواہی برتی گئی کہ ایک معصوم بچے کی جان چلی گئی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

(محمد صدیق قوم، کھڈیاں خاص)

دوسروں کی خوشیوں کا خیال رکھیں

ارسلان رشید اور فیضان رشید دونوں بھائیوں کو تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا وہ دونوں دل لگا کر پڑھتے تھے۔ ہر سال اپنی اپنی جماعت میں اچھی پوزیشن حاصل کرتے، بڑوں کا احترام اور اساتذہ کی بہت عزت کرتے۔ اس لیے اسکول میں ان کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو صبح کی سیر کا بہت شوق تھا۔ ایک دن ارسلان اور فیضان سیر کرنے گئے۔ شہر سے باہر کھیتوں کے بیچ ایک جگہ انہوں دیکھا کہ ایک گھسیارہ بیٹھا گھاس کھود رہا ہے، اس کے جوتے راستے میں ایک طرف پڑے تھے۔ فیضان بولا۔ ''بھائی ارسلان بڑا مزہ آئے اگر

ہم اس کے جوتے چپکے سے چھپا دیں۔ جب وہ دیکھے گا کہ اس کے جوتے غائب ہیں تو خوب پریشان ہوگا۔'' ارسلان بھائی نے جواب دیا۔ ''بھئی دوسروں کو پریشان کر کے مزہ اٹھانا اچھی بات نہیں۔ ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا، صرف اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے ایسے کام نہیں کرتے۔ کام ایسا ہونا چاہیے جس سے دوسروں کو فائدہ ہو اگر ہم اسے خوش کرسکیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔ تم کیا ترکیب کرو گے اسے خوش کرنے کی۔ فیضان بھائی نے پوچھا؟

دیکھو میرے پاس سوسو کے دو نئے نوٹ ہیں۔ لاؤ چپکے سے ایک سو کا نوٹ اس کے ایک جوتے میں ڈال دیں اور دوسرا نوٹ اس کے دوسرے جوتے میں رکھ دیں پھر دیکھیں کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات فیضان بھائی کی سمجھ میں آگئی۔ فیضان بھائی نے دونوں سوسو کے نئے نوٹ گھسیارے کے دونوں جوتوں میں ڈال دیئے اور دونوں بھائی کچھ دور بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد گھسیارے نے اپنی گھاس کی گٹھڑی باندھی اور اپنے جوتوں کے پاس آیا۔ جب جوتے پہننے لگا تو اسے نئے نئے نوٹ دکھائی دیئے۔ وہ اسے نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں؟

گھسیارے کا چہرہ خوشی کے مارے چمک رہا تھا۔ وہ دن بھر محنت کرتا تو جب کہیں دو تین سو کی گھاس بیچتا تھا۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا، اس نے جلدی جلدی اپنی گٹھڑی اٹھائی اور سیدھا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ دونوں بھائی بھی کچھ دور اس کا پیچھا کرنے لگے۔ جب گھسیارہ اپنے گھر پہنچا تو اس نے گھاس دروازے پر ہی ڈال دی، اس کے دو بچے کھیل رہے تھے، دونوں اس کو دیکھ کر اس کی طرف لپکے۔ گھسیارے نے ایک سو کا نوٹ ایک بچے کو دے دیا اور دوسرے نوٹ دوسرے بچے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں بچے روپے لے کر بہت خوش ہوئے۔ بچے دوڑتے دوڑتے اپنی ماں کے پاس پہنچے۔ ماں نے جب اپنے بچوں کے ہاتھ میں روپے دیکھے تو بہت خوش ہوئی۔ آج گھسیارے کا سارا گھر خوش تھا۔ ان لوگوں کو خوش دیکھ کر فیضان اور ارسلان کو بہت مزہ آرہا تھا۔ آج فیضان کی سمجھ میں آگیا کہ دوسروں کو پریشان کر کے خوش ہونے سے بہتر ہے کہ نیکی کر کے خوش ہوں۔ عام طور پر تفریح کے لیے دوست آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑتے ہیں یا پریشان کرتے ہیں کبھی کبھی یہ بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ خوشی کے بدلے الٹا رنج ہوتا ہے۔ آپس کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر تفریح کے لیے ایسی صورتیں پیدا کی جائیں جن سے دوسروں کو فائدہ ہو اور خوشی ہو تو ایسے عمل سے نہ صرف آپ بھی خوش ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ بھی آپ سے خوش ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اچھے اچھے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

ندامت کے آنسو

(محمد عمر فاروق، سیال کوٹ)

سبحان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ بہت ذہین بھی تھا۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ چوں کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس لیے اس کے والدین اس کا ہر ناز نخرہ اٹھاتے تھے۔ اس کے والد کی آمدنی قلیل تھی لیکن اس کے والد اس کی ہر خواہش پوری کیا کرتے تھے۔ جب اس نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس کا وظیفہ لگ گیا اور وہ بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلا گیا۔

سبحان اپنے دفتر کی میز پر بیٹھا کچھ فائلیں چیک کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی لیکن سبحان نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنا کام کرتا رہا لیکن فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ آخر تنگ آکر سبحان نے فون اٹھایا تو فون پر اس کی امی کہہ رہی تھیں۔ ''بیٹا گھر کب آرہے ہو۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔''

سبحان کرختگی سے بولا۔ ''امی! آپ کو پتا ہے میں بہت مصروف ہوں۔ بار بار فون کر کے مجھے تنگ مت کیجئے۔ میں نے گھر آنا ہوگا تو آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور سے فون پٹخا۔ یہ سن کر سبحان کی امی سکتے میں آگئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کا لاڈلا بیٹا ان سے اس طرح بات کرے گا۔

سبحان کی کمپنی بہت ترقی کر رہی تھی اور اب اس کے پاس بہت دولت آچکی تھی۔ اس دولت نے اسے بہت مغرور اور لاپرواہ بنا دیا تھا۔ دراصل جب وہ بیرون ملک سے تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تو اس نے آتے ہی کاروبار شروع کر دیا اور خوب

ترقی کی۔ اب اس کا کاروبار پر زیادہ دھیان ہوتا تھا اور گھر بہت کم جایا کرتا تھا۔ اس کا مزاج بہت کرخت ہو چکا تھا۔ نوکر چاکر اور کولیگز پر برہم ہونا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ اپنے امی ابو سے بھی سخت لہجے میں بات کیا کرتا تھا۔ سبحان نے اپنے والدین کو چھوڑ کر خود ایک خوب صورت بنگلہ خرید لیا تھا۔ ادھر اس کے والدین کا اس کی یاد میں بُرا حال تھا۔

برسات کی آمد آمد تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ سبحان کو اپنا گھر چھوڑے دو سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے والدین کو مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کتاب میں ایک عنوان لکھا تھا:

''والدین اپنے بچوں کو بڑے پیار اور شفقت سے پالتے ہیں۔ وہ ہر تکلیف اٹھا کر اپنی اولاد کو سکون پہنچاتے ہیں۔ اولاد کا فرض بنتا ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت کریں اور آرام پہنچائیں۔''

سبحان کو اپنے والدین کا پیار اور شفقت یاد آگئی کہ کس طرح اس کے والدین غریب ہونے کے باوجود اس کی ہر خواہش پوری کیا کرتے تھے۔ اس نے اپنے والدین کے پاس جانے کی ٹھانی۔ اس نے اپنی کار اس راستے پر دوڑا دی جدھر اس کے والدین رہا کرتے تھے۔ موسلا دھار بارش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں سبحان کے دل میں بے چینی تھی۔ بہرحال جب وہ گھر پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ وہاں لوگوں کا ہجوم ہے۔ وہ اپنی چھتری پکڑتا ہے اور کار سے باہر آکر صورت حال دریافت کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہونے کی وجہ سے کچے مکان کی چھت گر گئی اور ملبے تلے دب کر دو بزرگ مر گئے ہیں۔ سبحان نے جب یہ سنا تو وہ سکتے میں آگیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سبحان کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو جاری تھے مگر اب آنسو بہانے کا کیا فائدہ......! اب اس کے والدین دنیا میں واپس نہیں آسکتے تھے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

حضرت لعل شہباز قلندرؒ

آپ کا اصل نام عثمان اور لقب لعل شہباز قلندر ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام سید کبیر تھا۔ آپ کے آباؤ و اجداد مروند (جو اب مہمند بھی کہلاتا ہے) کے رہنے والے تھے۔ وہیں 538ء میں حضرت لعل شہباز قلندر کی ولادت ہوئی اور وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل۔ آپ کی ذات دنیاوی رجحانات سے پاک تھی۔ آپ نے ابتدا ہی سے کئی سال کی عبادت و ریاضت سے اپنے من کی دنیا کو منور کیا۔ بعدازاں آپ نے روحانی کمال کے حصول کی خاطر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا سفر کیا اور مختلف اولیا اکرام کی محبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ ان بزرگوں میں حضرت شیخ فرید گنج شکرؒ، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، مخدوم جہانیاں جلال الدین بخاریؒ قابلِ ذکر ہیں۔ سیر و سیاحت کے دوران آپ حضرت شیخ بوعلی قلندر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: ''مناسب یہی ہے کہ آپ سندھ تشریف لے جائیں اور وہیں سکونت اختیار کر لیں۔'' آپ بوعلی قلندر کے مشورے سے سندھ تشریف لے آئے اور سیہون میں مقیم ہو گئے۔ حضرت لعل شہباز قلندر نے تقریباً چھے سال سیہون میں قیام کیا۔ اس دوران آپ نے لوگوں میں توحید عام کرنے اور کفر و شرک ختم کرنے کے لیے دو واعظ کیے ان کی روشنی میں ہزاروں لوگوں نے فسق و فجور سے تائب ہو کر راہِ ہدایت پائی۔ کفر و جہالت کے چھٹنے سے سندھ اسلام کے نور سے منور ہوا۔ آپ کی کوششوں اور نصیحتوں سے ہزاروں لوگ برائی کی راہ چھوڑ کر حق کے راستے پر آگئے۔ آپ نے لوگوں کے اخلاق کو بھی سنوارا۔ ان کے دلوں سے کفر و کینہ نکال کر نیکی اور سچائی کی لگن پیدا کی۔ پاک و ہند میں جن اولیا اللہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ان میں سے بیشتر عالم فاضل شاعر اور بعض نثر نگار بھی تھے۔ مثلاً حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ اپنی تصوف کی اولین کتاب ''کشف المحجوب'' کے علاوہ کئی کتب کے مصنف تھے۔ اسی طرح حضرت لعل شہباز قلندر بھی شعر و سخن سے دل چسپی رکھتے تھے۔ شاعری میں آپ کا تخلص عثمان تھا۔ آپ بڑے عالم فاضل تھے۔ لسانیات اور صرف و نحو میں آپ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ 21 شعبان 673ء میں آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ ملک رکن الدین والئ سیہون نے آپ کا مزار تعمیر کروایا۔ جہاں ہر سال 21 شعبان کو حضرت لعل شہباز قلندر کا عرس منعقد ہوتا ہے۔

(اُم عادل، کراچی)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

چھلے سال کی بات ہے، گرمی کی شدت کو دیکھتے ہوئے حکومت نے وقت سے پہلے ہی چھٹیاں دے دی تھیں۔ ابرار نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور چھٹیاں ہونے کی اسے ہی سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس کے نانا ابا رائے ضمیر حسین چھٹیوں سے ایک دن پہلے اپنی دوا لینے شہر آئے تو ابرار نے ضد کر کے انہیں رات ٹھہرا لیا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ ابرار کو اپنے نانا کی محبت مجبور کیے ہوئے ہے مگر اصل بات کچھ اور تھی۔ ابرار نے چالاکی سے اپنے نانا ابا کو اس لیے ٹھہرا لیا تھا تاکہ کل چھٹیوں کا اعلان ہوتے ہی وہ نانا ابا کے ساتھ گاؤں چلا جائے گا۔ نانا ابا کا گاؤں چک میراں ننکانہ صاحب شہر سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔

ابرار چھٹیوں کا اعلان ہوتے ہی اپنے نانا ابا کے ساتھ چک میراں پور روانہ ہو گیا۔ چک جانے کا ایک خاص مقصد تھا۔ چند دن پہلے اس نے انٹرنیٹ پر چک میراں پور کے تاریخی ٹیلے کے بارے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ ابرار وہ ٹیلہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے خیال میں کوئی خزانہ دفن ہو گا۔ اس کے نانا ابا نے گاؤں کے متعلق تو خاصی مفید معلومات دی تھیں کہ چک میراں پور کی بنیاد مغل بادشاہ شاہ جہان کے بیٹے داراشکوہ نے 1625ء کے لگ بھگ رکھی تھی۔ مگر جب ابرار نے میراں پور کا تاریخی ٹیلہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو نانا ابا نے یہ کہہ کر صاف منع کر دیا۔ ”خبردار! قبرستان کی طرف کوئی نہیں جائے گا۔“

دراصل یہ ٹیلہ کبھی خوب صورت عمارات کا مجموعہ ہوا کرتا تھا مگر اب تاریخی عمارات ایک منہدم ٹیلے کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ مٹی کے اس ٹیلے سے لوگ اور تو کوئی کام نہ لے سکتے تھے اس لیے انھوں نے وہاں قبرستان بنا دیا تھا۔ کھنڈرات اور کچھ قبرستان کا خوف تھا لہٰذا لوگ اس طرف کم ہی جاتے تھے اور بچوں کو ڈرانے کے لیے طرح طرح کی گھڑی ہوئی باتیں مشہور کر رکھی تھیں۔ دو، تین دن تو ابرار نے صبر کیا مگر جب ایک دن موسلا دھار بارش برسی تو ابرار کو موقع مل گیا۔ وہ بارش میں نہانے کے بہانے دوستوں کے ساتھ نکلا اور ان کو لے کر ٹیلے پر پہنچ گیا۔ بادل گھما گھم گرج رہے تھے اور بارش چھما چھم برس رہی تھی۔

”ہمیں اس طرف نہیں جانا چاہیے۔ کہیں کوئی بھوت ہی نہ نکل آئے۔“ خبیب نے اپنے ٹراؤزر کو اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

ابرار نے رمیض سے پوچھا۔ ”رمیض تم تو یہاں رہتے ہو۔ اِدھر کبھی نہیں آئے کیا؟“

رمیض بولا۔ ”میرا یہاں کیا کام۔ ویسے سنا ہے اس ٹیلے میں کسی راجا کا خزانہ دفن ہے۔“

”چلو پھر آج ہم خزانہ ڈھونڈتے ہیں۔“ ابرار بولا اور سب ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ ٹیلے کی بلندی تقریباً چالیس فٹ تھی۔ ٹیلے کے اردگرد مٹی کے برتنوں کی کرچیاں بکھری پڑی تھیں۔ یہ برتن نجانے کتنے سو سال پرانے تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ برتنوں کے ٹکڑے پرانے ہیں یا نئے، ابرار نے چند ٹھیکریوں کو ٹھونک بجا کر

دیکھا مگر کچھ بھی اندازہ نہ کر پایا۔ پرانے، ٹیڑھے میڑھے اور عجیب و غریب درختوں کو دیکھ کر ابرار حیران ہو رہا تھا۔ اس کو تو ان درختوں کے نام بھی نہ آتے تھے، نہ ہی اسکول کی کتابوں میں ان کا کوئی ذکر تھا۔

ابرار کے لیے یہ بات ہمیشہ کوفت کا باعث بنتی تھی کہ اسکول میں انہیں دُنیا جہان کے پرندوں اور درختوں کے بارے میں پڑھایا جاتا تھا مگر پاکستان میں پائے جانے والے مقامی پرندوں اور درختوں کے متعلق انہیں کوئی معلومات نہیں دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ٹیلے پر موجود درختوں کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہاں اس کے نانا ابو نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ یہ 'ون' اور 'جنڈ' کے درخت ہیں۔ مگر یہ کتنے پرانے ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ تینوں کزن اپنے اردگرد یوں دیکھ رہے تھے جیسے کسی اور دُنیا میں آگئے ہوں۔ رمیض کو فکر تھی کہ کہیں اس کے ابو کو پتا نہ چل جائے کہ وہ لوگ ٹیلے پر گھومتے پھر رہے ہیں۔ جب کہ ابرار کو فکر تھی کہ اس اَن دیکھی جگہ سے کوئی نئی چیز دریافت ہو جائے۔ ٹیلے پر کھڑے ہو کر ابرار کی نظر ایک ڈھلوان پر پڑی۔ وہاں موجود ایک پرانے درخت کے پاس غار سی نظر آرہی تھی۔ ابرار سے نہ رہا گیا۔ وہ بولا۔ ''ادھر دیکھو! وہ غار۔ مجھے لگتا ہے خزانہ اسی غار میں دفن ہوگا۔''

رمیض ڈرپوک سا بچہ تھا اس لیے چڑ کر بولا۔ ''تجھے تو بس خزانے کی پڑی ہے۔'' لیکن ابرار نے رمیض کی بات سنی اَن سنی کر دی اور ڈھلوان کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ غار کیا تھی، درخت کے تنے کے قریب ٹیلے کے اندر چھوٹی سی کھوہ سی تھی۔ درخت کے تناور ہو جانے کی وجہ سے وہاں سے مٹی ہٹ گئی تھی اور ایک دہانہ سا بن گیا تھا۔

''ابرار رک جا، آگے سانپ بھی ہو سکتے ہیں۔'' خبیب چیخا۔ مگر ابرار اپنی دھن میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ اس کے دونوں کزن بھی مجبوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔

غار کے پاس پہنچ کر ابرار ذرا جھکا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اب بارش ختم ہو چکی تھی۔ بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساون کی بارش ایسی ہی ہوتی ہے۔ اچانک بادل گھر کے آتے ہیں اور بارش برسا جاتے ہیں۔ بارش تھمنے کا پتا بھی نہیں چلتا کہ سورج سر نکال لیتا ہے۔ سورج کی ایسی ہلکی سی روشنی میں ابرار نے مٹی کی اس غار میں جھانک کر دیکھا۔ بمشکل تین فٹ گہری غار میں کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں مگر ابرار کو ایک شے نظر آگئی تھی۔

غار کے دہانے میں چند پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ مزید ننھے ننھے پودے بھی زمین سے سر نکال رہے تھے۔ ابرار کو خاصی خوش گوار حیرت ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان پودوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے یہ پودے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ ابرار نے نعرہ لگایا۔ ''ہُرّا...... مجھے خزانہ مل گیا!'' اس کے دونوں کزن بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ مگر جب پودے دیکھے تو ان کے منہ بن گئے۔

''یہ خزانہ ہے کیا؟ پودے ہی تو ہیں۔'' خبیب نے منہ بنا کر کہا۔

''خزانہ دیکھ لو ابرار کا۔ واہ جی واہ۔'' رمیض نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

اب ابرار مسکرا کر بولا۔ ''ارے یار یہی تو خزانہ ہے۔ سونا چاندی ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ یہ قیمتی پودے انہیں پرانے درختوں کے بیجوں سے اُگے ہیں۔ یہ ہمیں کسی نرسری سے نہیں ملیں گے۔ میں انہیں گھر پر اگاؤں گا اور کچھ اسکول میں لگاؤں گا۔ میرے ٹیچر بہت خوش ہوں گے۔ یاد ہے نا پچھلی سردیوں میں فوگ کا کتنا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھیں اور گلے خراب ہو گئے تھے۔ یہ سب درختوں کی کمی سے ہو رہا ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ درخت لگانے ہوں گے تاکہ ماحول کو آلودگی سے بچا سکیں۔ تبھی ہم تندرست رہیں گے۔ جیبیں بھر لینا ہی خزانہ نہیں ہوتا۔ اچھی صحت سب سے اچھا خزانہ ہوتا ہے۔'' رمیض اور خبیب نے شرم ساری کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سب نے مل کر چند پودے اکھاڑے، ان کی جڑوں میں اچھی طرح مٹی لگائی اور گھر لے گئے۔

نانا ابو کو جب ابرار کی اس بات کا پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوئے کہ بچوں میں ماحول صاف رکھنے کا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ چند پودے نانا ابو کے گھر لگا کر باقی پودے ابرار اپنے ساتھ شہر لے گیا۔ وہ اس نایاب خزانے کو پا کر بہت خوش تھا۔ اگر آپ ایم سی ہائی اسکول ننکانہ صاحب کی سیر کرنے جائیں تو آپ کو یہ پودے ضرور دکھائی دیں گے۔

☆☆☆

علامہ محمد اقبالؒ بیسویں صدی کے شہرہ آفاق دانش ور، عظیم روحانی شاعر، اعلیٰ درجہ کے مفکر اور بلند پایہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عہد ساز انسان بھی تھے۔ ایسی زندہ و جاوید ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا دل ملتِ اسلامیہ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے وارث تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زوال اور غلامی کی کھائی میں گرتے ہوئے عالم اسلام کے ضعیف تن میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے انقلاب کی راہ دکھائی۔

ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر محمد اقبالؒ 9 نومبر 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پرانے طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ یہاں ان کے استاد مولانا غلام حسین تھے۔ پھر مولوی میر حسن کے مکتب سے درس لیتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے مشورے سے سیال کوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں داخل ہوئے۔

علامہ اقبال اپنے بچپن کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''جب میں سیال کوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ والد صاحب اپنے وظائف کے کمرے سے فارغ ہو کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزرتے۔ ایک صبح جب میں حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، وہ میرے پاس آئے اور فرمایا۔ ''بیٹا! جب تم قرآن مجید پڑھو تو سمجھ کر پڑھو کہ جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے جس شکل میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کیے وہ کس قدر روشن تھے۔

کالج کی پڑھائی کے دوران جب وہ ہوسٹل میں رہتے تھے تو پڑھائی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز کالج کے پرنسپل صاحب ہوسٹل کا چکر لگاتے ہوئے علامہ اقبال کے کمرے کی طرف آئے اور انہیں پڑھتے دیکھ کر کہنے لگے کہ تمام لڑکے باہر کھیل رہے ہیں اور ورزش میں مصروف ہیں اور تم یہاں پڑھ رہے ہو۔ علامہ اقبال نے مودبانہ جواب دیا۔ ''جناب یہ بھی ایک قسم کی ورزش ہے۔''

آپ اپنے اساتذہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ بچپن کا واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ کسی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور سے حضرت علامہ میر حسن آتے دکھائی دیئے۔ آپ جوتا اتار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی طرح ننگے پاؤں مولوی صاحب کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ ہولیے۔ مولوی صاحب کو گھر پہنچا کر واپس لوٹے اور پھر جوتے پہنے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے اساتذہ کا کس قدر احترام کرتے تھے۔

آپ بہت حاضر جواب تھے۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک دن آپ کو اسکول پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ماسٹر صاحب نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ ''اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔'' اس عمر میں یہ جواب...... اس ذہانت پر ماسٹر صاحب اور سبھی دنگ رہ گئے۔

بچپن ہی سے آپ ہمیشہ صبح تہجد کے وقت بیدار ہوتے اور قرآن مجید کی تلاوت خوش الحانی سے کرتے، لفظ لفظ پر غور کرتے تھے۔

علامہ اقبال کو حضرت محمد ﷺ سے بے حد عشق تھا۔ آپ کے نزدیک عشق رسول ہی مسلمانوں کے لیے دین اور دنیا کی فلاح کا

موجب ہے۔

اعمالِ حسنہ کے متعلق ایک مجلس میں فرمایا کہ یہ کبھی ضائع نہیں جاتے۔ اس ضمن میں آپ نے اپنے والد محترم کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک روز شیخ نور محمد رومال میں تھوڑی سی مٹھائی لیے گھر آ رہے تھے۔ راستے میں ایک کتے کو بھوک پیاس کے مارے دم توڑتے دیکھا۔ مٹھائی اس کتے کے آگے ڈال دی اور کہیں سے پانی لا کر پلایا۔ رات کو خواب دیکھا جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ رب ان کے دن پھیرنے والے ہیں۔ اس واقعے کے بعد کسی کے کہنے پر میرے والد نے دھسوں (گرم شالوں) کی تجارت شروع کی۔ جس میں اچھا خاصا نفع ہوا اور ہمارے دن پھر گئے۔

بچپن میں آپ کے والد نے ایک دن آپ سے کہا کہ میں نے تمہاری تعلیم میں جو محنت صرف کی ہے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ آپ نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ آپ کے والد نے کہا۔ جب تعلیم مکمل کر لو تو اسلام کی خدمت کرنا۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ جب میں نے پڑھائی سے فارغ ہو کر لاہور میں وکالت شروع کی اور ساتھ ہی میری شاعری کا چرچا ہوا۔ لوگوں نے میری شاعری کو ذوق و شوق سے سنا اور سامعین میں ولولہ پیدا ہونے لگا۔ ان ہی دنوں میرے والد بیمار ہو گئے۔ میں ان کو دیکھنے لاہور سے سیالکوٹ آیا۔ ایک دن میں نے اپنے والد بزرگوار سے پوچھا۔ "آپ سے جو میں نے اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں۔" باپ نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ میرے جگر کے ٹکڑے تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔

آپ نے اپنے اشعار کے ذریعے مسلمانوں خاص طور پر نوجوانوں اور بچوں میں اسلامی اور سیاسی شعور بیدار کیا اور طلباء کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ نوجوانوں کے لیے اردو اور فارسی میں بہت سی نظمیں لکھیں جنہیں آج بھی سب بچے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

آپ نے بچوں کے لیے نظم "دعا" لکھی جو آج بھی ہر اسکول میں اسمبلی کے دوران پڑھ کر بچے عہد کرتے ہیں کہ وہ آپ کی نصیحتوں پر عمل کر کے نیک انسان بننے کی کوشش کریں گے۔ دعا کے الفاظ یہ ہیں:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

پیارے بچو! ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ عہد ساز شخصیت 21 اپریل 1938ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عظیم شاعر پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے۔ آمین! ☆☆☆

بانگ درا

بانگِ درا، اقبال کا پہلا اردو مجموعہ کلام ہے۔ بانگِ درا کا پہلا ایڈیشن 3 ستمبر 1924ء کو شائع ہوا۔ اس کے تین ایڈیشن اقبال کی زندگی میں شائع ہوئے۔ بانگِ درا کو اقبال نے ترتیب دیتے ہوئے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں 1901ء سے 1905ء تک کا کلام، دوسرے حصے میں 1905ء سے 1908ء تک کا کلام اور تیسرے حصے میں 1908ء سے لے کر 1924ء تک کا کلام شامل ہے۔ یہ ترتیب اقبال کے فکری ارتقاء کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں، غزلیں اور ظریفانہ قطعات شامل ہیں۔ بانگِ درا میں شامل کلام اس سے پہلے مختلف رسائل و اخبارات خصوصاً عبدالقادر کے "مخزن" میں شائع ہوتا رہا۔ بیشتر نظمیں لاہور کے مشاعروں اور انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں علامہ اقبال ترنم سناتے رہے تھے۔ اقبال کا یہ کلام زبان زدِ خاص و عام تھا اور شائقین کی یہ خواہش تھی کہ اسے مجموعے کی شکل میں یک جا کر دیا جائے۔ چناں چہ بانگِ درا کی شکل میں اردو شاعری کے قارئین کو ایک بے مثال مجموعہ ہاتھ لگا۔ شیخ عبدالقادر کے بقول "یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے، جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یک جا ہوں۔" بانگِ درا کا دیباچہ مدیرِ مخزن شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا۔

بانگِ درا کا مطلب ہے "گھنٹی کی آواز" جرس یا درا کی آواز قافلے والوں کو کوچ اور روانگی کی اطلاع دیتی ہے تاکہ سوئے ہوئے مسافر سفر کے لیے تیار ہو جائیں اور پھر بانگِ درا کی رہنمائی میں منزل کی طرف رواں دواں ہو جائیں۔ اقبال کی یہ "بانگِ درا" اسمِ بامسمیٰ ہے اور قوم کے لیے بیداری کا پیغام ہے، وہ خود کہتے ہیں:

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

☆☆☆

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

السلام و علیکم! ڈیئر آپی! کیسی ہیں آپ؟ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا ایک معلوماتی سلسلہ ہے۔ اشتیاق احمد کا کوئی ناول شروع کر دیں۔ تعلیم و تربیت کا خاص نمبر کب شائع ہو گا؟ میں آپ کو ایک کہانی بھیج رہا ہوں۔ ضرور شائع کیجیے گا۔ مارچ میں میرے بورڈ کے پیپرز ہیں۔ دعا کریں کہ میرے 97% سے زیادہ نمبر آئیں۔ (محمد ولید، لاہور)

☆ اللہ تعالٰی آپ کو امتحان میں کام یاب کرے۔ آمین

السلام و علیکم! کیا حال ہیں؟ آج میں بہت خوش ہوں۔ میں کلاس ون میں فرسٹ آیا ہوں اور آج ہی میرے مما اور پاپا ''تعلیم و تربیت'' بھی لے آئے جس میں تین سلسلوں میں میرا نام چھپا ہے۔ یہ میری پہلی کوشش تھی۔ آپ کی حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ اگر انعام بھی قسمت میں ہوا تو مل ہی جائے گا۔

لطیفے پڑھ کر بہت ہنسی آئی ہے۔ آپ کا رسالہ اور سارے سلسلے اچھے ہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کے رسالے کو ترقی دے۔ میری بہن وانیا معراج بھی آپ کا رسالہ شوق سے ابھی صرف ''دیکھتی'' ہے وہ پریپ میں ہے۔ یہ خط میں اپنی مما سے لکھوا رہا ہوں ضرور چھاپیے گا۔ اللہ حافظ۔ (محمد ارحم معراج، وانیا معراج، سرگودھا)

☆ آپ کی پسندیدگی کا شکریہ! اپنی ماما جان کو میرا سلام کہیے گا۔

مدیرہ تعلیم و تربیت السلام و علیکم! امید ہے کہ آپ اللہ تعالٰی کے فضل سے ٹھیک ہوں گی۔ آپ سب کو یوم پاکستان مبارک ہو۔ نئی بہار نظم بہت پسند آئی۔ کہانی استاد کا فرض بہت اچھی لگی۔ گوّیا اور ڈاکٹر اللہ دتہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ لطیفے پڑھ کر اتنی ہنسی آئی کہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ محاورہ کہانی بھی پسند آئی۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا اور خوب صورت جانور اور پرندے پڑھ کر ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ خوش قسمت حسن نے راجا رانی کی یاد دلا دی۔ چڑیا کی ممتا اور دعا بھی پسند آئی۔ قسمت کا چکر بھی اچھی کہانی تھی۔ جناب عالی! پڑھ کر ڈرامہ بانو کا گھر یاد آ گیا۔ اللہ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (مریم منیر، چونیاں)

☆ پسندیدگی اور دُعاؤں کا شکریہ۔

السلام و علیکم! پیاری اور سویٹ آپی! امید ہے کہ آپ اور تعلیم و تربیت کی ٹیم خیر خیریت سے ہو گی اور اگلا شمارہ تیار کرنے میں مصروف ہوں گی۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا اور دل چسپ رسالہ ہے۔ اس سے ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں اور کہانیوں سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بہت دل چسپ تھا۔ خوش قسمت حسن کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ارے میں تو باتوں باتوں میں اصل بات تو بھول ہی گئی۔ آپ سے گزارش ہے کہ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا اور آیئے مسکرایئے کے صفحات بڑھائے جائیں۔ میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی ضرور شائع کیجیے گا۔ (عینیہ، واہ کینٹ)

السلام و علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ مارچ کا شمارہ لاجواب تھا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ استاد کا فرض، ڈاکٹر اللہ دتہ، قسمت کا کھیل، روبوٹ اور دعا عمدہ کہانیاں تھیں۔ جناب عالی بھی اچھی تھی۔ مختصر مختصر بہت عمدہ اور میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ باقی تمام کہانیاں بھی لاجواب تھیں خاص طور پر مینار پاکستان کی کہانی۔ آپی آپ جیسے پہلے مزاحیہ کہانیاں شائع کرتی تھیں، اس سلسلے کو دوبارہ شروع کریں اور دوسری گزارش ہے کہ جاسوسی ناول شائع کیجیے۔ ایڈیٹر صاحبہ، مہربانی فرما کر یہ بتا دیجیے کہ ہمیں تعلیم و تربیت کے کتنے سال پرانے رسالے مل سکتے ہیں؟ اس مہینے میرے بورڈ کے امتحان ہیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ تعالٰی ہمارے پیارے رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔ (فلزہ وقار، جہلم)

☆ خوب صورت خط لکھنے کا شکریہ! آپ کی تجاویز پر جلد ہی عمل کریں گے اور آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔

السلام و علیکم! اس بار کا رسالہ ایک ہی دن میں پڑھ کر ختم کر لیا۔ رسالہ زبردست تھا۔ روبوٹ کے آخر کی کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ کہانی جناب عالی زبردست تھی اور دعا سب پر بازی لے گئی۔ کیا ڈاکٹر اللہ دتہ کی کہانی سچی تھی؟ پلیز جو کہانی سچی ہو اس پر لکھ دیا

کریں۔ اس شمارے میں قسمت کا چکر بھی ٹاپ پر تھی۔ اس سے پہلے صرف ایک بار میرا خط شائع ہوا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی مگر میری دوست نے یقین نہیں کیا کہ یہ میرا خط ہی تھا۔ پلیز قندِمکرر بھی شائع کیا کریں۔

(حافظ عفیفہ اشرف، لاہور)

☆ پیاری عفیفہ! ہم اکثر قندِ مکرر شائع کرتے رہتے ہیں۔ اپنی دوست کو اپنا یہ خط ضرور دکھایئے گا۔

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں عروج پر تھیں۔ اس شمارے میں اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اب میں آپ سے ناراض نہیں۔ لیکن اب آپ میرا خط شائع کرنا بند تو نہیں کر دیں گی نا؟ ڈاکٹر اللہ دتہ اور روبوٹ ٹاپ پر تھیں۔ مینار پاکستان کی کہانی پڑھ کر بہت سی معلومات ملیں۔ آپی! آپ لوگ کوئی اچھا سا ناول بھی شروع کر دیں۔ بہت سی تحریریں بھیج رہی ہوں معیاری ہوئیں تو ضرور شائع کیجیے گا اور ساتھ ساتھ رہنمائی بھی کیا کریں تا کہ بہتر سے بہتر اور اچھی سے اچھی تحریریں بھیج سکیں۔ میرے سالانہ امتحان ہونے والے ہیں۔ پلیز تعلیم و تربیت کے تمام قارئین اور آپ میری کامیابی کے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔ اچھا اب اجازت چاہتی ہوں آخر میں ایک شعر صرف ایڈیٹر آپی کے لیے:

کہاں سے تو نے اے "ایڈیٹر" سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

(میمونہ نوید، راول پنڈی)

☆ پیاری میمونہ! پیارا سا شعر میرے لیے لکھا ہے لیکن میں اس قابل کہاں؟ آپ کی محبتوں کا شکریہ!

ڈیئر مدیرہ تعلیم و تربیت السلام وعلیکم! کیسی ہیں آپ؟ امید ہے اللہ کے کرم سے ٹھیک ہوں گی۔ تعلیم و تربیت نہ صرف بچوں کے لیے اچھا رسالہ ہے بلکہ بڑوں کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ میں تقریباً تعلیم و تربیت کو چھ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس رسالے کے آنے پر میری اور میرے بھائی جان کی لڑائی ہوتی ہے کہ میں نے پہلے پڑھنا ہے۔ تعلیم و تربیت آہستہ آہستہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے شمارے کی تمام کہانیاں اعلیٰ تھیں۔ میں یہ خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔ اللہ اس رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین!

(حافظہ اسبہ بنت الیاس، فیصل آباد)

السلام وعلیکم! میں آپ سے بہت ناراض ہوں۔ میں ہر ماہ تعلیم و تربیت کے ہر سلسلے میں حصہ لیتی ہوں مگر تقریباً دس ماہ سے آپ میری کوئی چیز شامل نہیں کر رہے۔ پلیز! اس بار میرے خط کو تعلیم و تربیت میں جگہ دی جائے۔ میں اس مرتبہ سلسلہ آپ بھی لکھیے میں کہانی، بلاعنوان کا عنوان، ہونہار مصور میں تصویر بھیج رہی ہوں۔ پلیز! ضرور شائع کیجیے گا۔ اوہو! اتنی طوالت اور تعریف ایک بھی نہیں۔ آیئے اب تعلیم و تربیت کی تعریف کی طرف چلتے ہیں۔ مارچ کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ سرورق سے لے کر ہونہار مصور تک ہر سلسلہ ہر کہانی فنٹاسٹک تھی۔ مگر کہانیوں میں گویا، قسمت کا چکر، ڈاکٹر اللہ دتہ، مینار پاکستان کی کہانی اور دعا زبردست تھی۔

ڈبے میں ڈبہ ڈبے میں کیک
ہمارا تعلیم و تربیت لاکھوں میں ایک

(عیشہ فاطمہ، فیصل آباد)

☆ خوب صورت شعر کا بہت شکریہ! آپ کی چیزیں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

السلام وعلیکم! ایڈیٹر صاحبہ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی اور مارچ کا رسالہ تیار کرنے میں مصروف ہوں گی۔ سب کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ کہانی ڈاکٹر اللہ دتہ پسند آئی۔ باقی کہانیاں استاد کا فرض، دعا، گویا، قسمت کا چکر، خوش قسمت حسن اور روبوٹ سب بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ بچوں کے انسائیکلوپیڈیا سے بہت زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام، دماغ لڑاؤ، بوجھو تو جانیں، کھوج لگائیں، آیئے مسکرایئے، آپ بھی لکھیے، میری زندگی کے مقاصد، بلاعنوان، کھیل دس منٹ کا اور ایڈیٹر کی ڈاک سب بہت اچھے سلسلے ہیں۔ آپ نیا ناول کب شروع کر رہی ہیں؟ مارچ میں میرا رزلٹ آنا ہے۔ میرے لیے دعا کرنا کہ میں امتحانات میں شان دار کامیابی حاصل کروں۔ (آمین)۔ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

پھول تو بہت ہیں لیکن گلاب جیسا کوئی نہیں
رسالے تو بہت ہیں لیکن تعلیم و تربیت جیسا کوئی نہیں

(حانیہ رضا، لاہور)

☆ ڈیئر حانیہ اب آپ کا خط شامل ہے۔ اب تو ناراض نہیں ہیں؟ رسالے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام بچوں کو امتحانات میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین!

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ اصفہان شہر میں ایک شخص رہا کرتا تھا جس کا نام احمد تھا۔ وہ لوگوں کے جوتے مرمت کرکے اپنی روزی کماتا تھا اور اس سے اپنی گزر بسر کیا کرتا تھا مگر اس کی بیوی ایک لالچی عورت تھی۔ وہ ہمیشہ احمد سے جھگڑا کرتی اور اپنی قسمت کو کوستی رہتی تھی۔ اس کا نام ستارہ تھا۔ وہ ہمیشہ دولت کمانے کے الٹے سیدھے منصوبے بناتی اور احمد کو پریشان کرتی رہتی۔ اس کی باتیں سن کر احمد کوئی جواب نہ دیتا بس سر ہلا کر رہ جاتا۔ اسے دولت کا کوئی لالچ نہ تھا اور وہ اپنے موجودہ کام سے مطمئن تھا اور ہمیشہ اسی پر خدا کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔

ایک روز ستارہ کچھ خریداری کرنے بازار گئی تو وہاں اس نے ایک امیر کبیر عورت کو زرق برق لباس میں ملبوس اور زیورات سے لدے پھندے دیکھا۔ وہ ایک شان دار بگھی میں سوار تھی اور اس کے آس پاس خادموں، غلاموں اور کنیزوں کی ایک فوج ظفر موج موجود تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر ستارہ ششدر رہ گئی اور اس کی رال بھی ٹپکنے لگی۔ ستارہ کو بھی ایسی ہی امیرانہ زندگی کی خواہش تھی۔ اس نے بگھی کے ساتھ ساتھ دوڑنے والے غلاموں سے اس امیر عورت کے متعلق دریافت کیا تو غلام نے بتایا کہ یہ عورت شاہی نجومی کی بیوی ہے جو شہر سے باہر دریا کی سیر کرنے گئی تھی اور اب واپس اپنے محل جا رہی ہے۔ ستارہ پوری معلومات حاصل کر کے اپنے گھر واپس آگئی اور آتے ہی منہ پھلا کر گھر کے ایک کونے میں پڑ گئی، اس نے احمد کی کسی بات کا جواب بھی نہ دیا۔ کوئی کام کیا نہ ہی کھانا پکایا۔ کئی گھنٹے وہ اسی طرح منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ احمد بھی اپنے کام میں مصروف رہا۔ وہ تو دل ہی دل میں خوش تھا کہ آج اس کی بیوی خاموش ہے ورنہ اس وقت تک کئی بار جھگڑا ہو چکا ہوتا۔ آخر جب احمد نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو ستارہ خود ہی بول اٹھی اور کہنے لگی۔

"احمد......! تمہیں میرا ذرہ بھر بھی خیال نہیں ہے۔ تم نہیں چاہتے کہ میں خوش رہوں۔"

"آخر تم کیا چاہتی ہو۔ میں تمہارے لیے کیا کروں؟" احمد نے بے بسی سے پوچھا۔

"تم اپنا یہ جوتے مرمت کرنے والا کام چھوڑ دو، یہ بالکل بے کار ہے اس سے گزارہ بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ تم دن بھر کی محنت کے بعد بمشکل دس دینار کما پاتے ہو۔ تم یہ کام چھوڑو اور نجومی بن جاؤ

اس میں بہت اشرفیاں ملتی ہیں۔"

ستارہ کی بات سنتے ہی احمد حیرت سے چلاّ اٹھا۔" تم پاگل ہو گئی ہو کیا...... ارے میں ایک موچی ہوں مجھے علم نجوم کا کیا پتا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں ایک ایسا کام کروں جس کی الف ب بھی مجھے معلوم نہیں۔"

" مجھے تمہاری قابلیت اور علم کی کوئی پرواہ نہیں۔ اگر تم فوراً نجومی نہ بنے تو میں تمہیں گھر سے باہر نکال دوں گی۔" ستارہ غصے سے بولی۔

احمد نے اسے بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ ستارہ کی نظروں میں تو زیورات سے لدی پھندی اور شان و شوکت والی شاہی نجومی کی بیوی تھی۔ وہ خود بھی ایسا ہی بننا چاہتی تھی اس لیے وہ ساری رات آنے والی دولت کے خواب دیکھتی رہی۔

بے چارہ احمد کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو موچی تھا نجومی نہیں، مگر اس کے پاس اپنی بیوی کی ضد ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ورنہ وہ اسے گھر سے نکال دیتی۔ احمد کے پاس دوسرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا جہاں وہ چلا جاتا اس لیے بادل نخواستہ وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔

دوسرے دن اس نے اپنا جوتے مرمت کرنے والا سارا سامان فروخت کر کے کچھ رقم حاصل کی اور پھر اس رقم سے نجومیوں کا سامان خرید لیا اور یہ سارا سامان لے کر بازار چلا گیا۔ جہاں سڑک کے کنارے بیٹھ کر وہ لوگوں کے جوتے مرمت کیا کرتا تھا وہیں اس نے اپنی نجومی والی میز لگا لی۔ اس پر الم غلم اشیاء رکھیں، میز پر بارہ برجوں کے نشان سجائے اور آواز لگانے لگا۔

" آؤ لوگو...... قسمت کا حال معلوم کر لو۔ میں نجومی ہوں اور تمہیں تمہارے مستقبل کی خبر دوں گا۔ مجھے سورج چاند کی ہر حرکت کا علم ہے۔ آؤ پوچھو جو پوچھنا چاہتے ہو۔ میں ہر چیز بتاؤں گا جو تمہاری قسمت میں ہونے والی ہے۔"

اس بازار میں ہر شخص اس کو احمد موچی کے نام سے جانتا تھا اس لیے فوراً ہی ایک ہجوم اس کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ ایک شخص اُسے دیکھتے ہی ہنس کر پوچھنے لگا۔

"ارے احمد!...... یہ تم کیا کر رہے ہو۔"

"لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے اور تم پاگل ہو گئے ہو۔" ایک اور شخص بولا۔

" ارے...... تم اب جوتے سیتے سیتے آسمان کے برجوں کو ٹانکے لگانے لگے۔" ایک قریبی دکان دار ہنس کر بولا۔ اس کے بعد وہاں موجود سارے ہی لوگ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ ہر کوئی اس پر جملے کس رہا تھا۔ احمد منمنا کر اپنی صفائی دینے لگا۔

" ارے دوستو!...... میں تو پہلے سے ہی نجومی تھا بس گزر اوقات کے لیے موچی بنا تھا۔ اب میں نے دوبارہ اپنا پہلا اور اصلی کام شروع کر دیا ہے۔"

اس وقت جب یہ لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے، اتفاق سے بادشاہ کا شاہی سنار وہاں سے گزرا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ پریشان تھا کیوں کہ چند دن پہلے بادشاہ نے اسے ایک نیا شاہی تاج بنانے کا حکم دیا تھا اور اس میں لگانے کے لیے ایک بہت بڑا یاقوت اپنے خزانے سے نکال کر اسے دیا تھا لیکن یہ شاہی سنار اپنی غفلت سے وہ یاقوت کہیں گم کر بیٹھا تھا۔ شاہی سنار نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر وہ مل نہ سکا۔ اس کی گم شدگی کو آج دوسرا دن تھا۔ شاہی سنار اس کے لیے بہت پریشان تھا کیوں کہ وہ اس کے متعلق کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر یاقوت کی گم شدگی کی خبر بادشاہ تک پہنچ گئی تو وہ غصے میں اس کا سر قلم کروا دے گا۔ مایوسی کے اس عالم میں وہ سوچوں میں گم اس ہجوم کے قریب سے گزرا جہاں احمد مجمع لگائے بیٹھا تھا۔ اتنے سارے لوگ جمع دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"بھائی! خیریت ہے۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

ایک شخص ہنستے ہوئے کہنے لگا۔" کیا تم نے احمد موچی کا نام نہیں سنا۔ آج وہ یکا یک نجومی بن گیا ہے۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ سنار نے جونہی "نجومی" لفظ سنا وہ فوراً ہجوم کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا احمد کے قریب پہنچ گیا اور اسے دھیمی آواز میں یاقوت کی گم شدگی کا سارا ماجرا سنا دیا اور بولا۔

"احمد اگر تم واقعی نجومی ہو تو آسانی سے میرا یہ یاقوت تلاش کر سکتے ہو۔ میں اس کے بدلے تمہیں سونے کی پوری دو سو اشرفیاں دوں گا لیکن اگر تم آج شام تک حساب لگا کر یاقوت تلاش نہ کر سکے تو میں اس شہر کے کوتوال سے کہہ کر تمہیں جیل میں ڈلوا دوں گا جہاں تم اپنی باقی ساری زندگی سڑتے رہنا۔"

شاہی سنار کی یہ دھمکی سن کر احمد کے پاؤں تلے سے زمین نکل

گئی۔ اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی کیوں کہ وہ تو کیا اس کے باپ دادا میں سے بھی کوئی کبھی نجومی نہیں تھا، نہ ہی اس کو ستاروں کی چالوں کا کوئی علم تھا۔ پھر وہ کیسے حساب لگا کر گم شدہ یاقوت کا پتا چلاتا۔ اس کو جیل کی کال کوٹھڑی سامنے صاف نظر آنے لگی۔ اس صورت حال کی پوری ذمہ دار اس کی لالچی بیوی تھی جس کے کہنے پر وہ نجومی بنا تھا۔ مصیبت کو سامنے دیکھ کر وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔

''اے عورت...... تیرا ستیاناس ہو، تو نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ خدا تجھے غارت کرے۔''

سنار کا گم شدہ یاقوت اصل میں اس کی ہی ایک کنیز نے چرایا تھا۔ یہ کنیز اس کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی اور دوسرے تمام ملازمین کی نگران تھی مگر وہ سنار کے سخت رویے کی وجہ سے بہت تنگ تھی۔ سنار اپنی کنیزوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ ان سے بہت سا کام لیتا اور ہر وقت ڈانٹتا رہتا۔ اس کنیز نے ایک دن موقع غنیمت جان کر وہ شاہی یاقوت چھپا لیا تا کہ بادشاہ اس کی سزا سنار کو دے اور سنار کو سبق حاصل ہو سکے۔ اس کنیز نے اپنی ایک راز دار کنیز کو اس کام پر لگا رکھا تھا کہ وہ اسے پوری معلومات دیتی رہے کہ کہیں سنار کو اس پر شک تو نہیں ہو گیا۔ اس دن بھی جب سنار اپنے گھر سے نکلا تو یہ رازدار کنیز چپکے سے اس کے پیچھے ہو لی تا کہ اس کا پیچھا کر کے معلومات حاصل کرے اور اپنی نگران کنیز تک پہنچائے۔

سنار کو ایک نجومی سے باتیں کرتا دیکھ کر وہ کنیز قریب آ گئی اور چپکے سے ان کی باتیں سننے لگی۔ جب احمد نے بے اختیار ہو کر کسی عورت پر لعنت بھیجی تو کنیز سمجھی کہ احمد نجومی کو اپنے علم نجوم کی مدد سے یہ علم ہو گیا کہ یاقوت ایک عورت نے چرایا ہے۔ حالانکہ احمد اپنی بیوی کے بارے میں بات کر رہا تھا جس کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں گرفتار ہوا تھا۔ احمد کی بات سنتے ہی وہ بھاگی بھاگی سیدھی اپنی نگران کنیز کے پاس پہنچی اور پھولی ہوئی سانس میں کہنے لگی۔

''محترم کنیز اعلیٰ! آپ کا راز کھل گیا ہے۔ آپ کی چوری ایک نجومی کے علم میں آ گئی ہے اور وہ شام تک ساری بات مالک کو بتا دے گا پھر آپ کا بھید کھل جائے گا اور آپ کو کیا سزا ملے گی یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' اس کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا، سنا تھا۔ سب اس کو بتا دیا۔

کنیز اعلیٰ بھی اس کی بات سن کر گھبرا گئی۔ اس نے فوراً ایک بڑی سی چادر اوڑھی، اپنا چہرہ چھپایا اور اپنی رازدار کنیز کے ہمراہ چپکے سے باہر نکلی اور احمد نجومی کی دکان کی طرف چل دی۔ وہ ابھی تک سڑک کے کنارے پریشان بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کنیز اس کے قدموں میں گر گئی اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

''اے مہربان نجومی...... میری جان بچا لو۔ میں تمہیں سب حقیقت بتا دیتی ہوں۔''

''تم مجھے کیا حقیقت بتاؤ گی...... اور تم کون ہو......؟'' احمد حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

''سب حقیقت تو تم پہلے ہی سے جانتے ہو۔'' سنار کی کنیز عاجزی سے بولی۔ ''تم جان چکے ہو کہ میں نے ہی بادشاہ کا یاقوت چوری کیا ہے جو شاہی تاج میں لگنے کے لیے شاہی سنار کے پاس آیا تھا۔ میں نے ایسا اس لیے کیا کہ مجھے یاقوت بیچ کر کچھ دولت مل جائے گی اور سنار کو اپنے ظلم کی سزا۔ مگر اے بے مثال نجومی تو نے اپنے علم کے زور سے ساری حقیقت معلوم کر لی ہے۔ اب مجھ پر رحم کرو اور میری جان بچا لو۔ تم جو کچھ مانگو گے میں دوں گی۔''

اس کنیز کی گفت گو سنتے ہی احمد ساری بات سمجھ گیا۔ اس کی تو جیسے باچھیں ہی کھل گئیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کے مصداق وہ فوراً ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''اے ظالم عورت تو نے اپنے مالک کو دھوکا دیا ہے یہ بات اگر میں تمہارے آقا سنار کو بتا دوں تو وہ تمہیں سخت سزا دے گا۔ مگر تم نے اچھا کیا کہ میرے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا۔ مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ ابھی بھی معاملہ سلجھ سکتا ہے۔ تم گھر واپس جاؤ اور جا کر چپکے سے وہ یاقوت سنار کے بستر پر پڑے داہنے تکیے کے نیچے رکھ دو جو دروازے کی طرف ہے مگر خیال رہے تمہاری اس حرکت کا کسی کو علم نہ ہو۔''

کنیز نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی اسے دی اور فوراً گھر واپس پہنچ کر احمد کے کہنے پر حرف بحرف عمل کیا۔ شام کے قریب جب وہ سنار دوبارہ احمد کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا۔

''اے نجومی کیا تم نے میرا کام کیا۔ تمہارا حساب کیا بتاتا ہے میرا یاقوت کہاں ہے اور کس نے چوری کیا ہے......؟''

''تمہارا یاقوت کسی نے چوری نہیں کیا ہے وہ تمہارے گھر میں ہی کہیں پڑا ہے۔'' احمد نے اپنے لہجے کو گمبھیر بناتے ہوئے جواب دیا۔

''گھر میں کہاں؟ میں نے تو اپنے گھر کا کونا کونا چھان مارا ہے وہاں تو مجھے کچھ بھی نہیں ملا۔'' سنار حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''تمہارا یاقوت کہاں ہے، اس کا حساب میں تمہارے گھر جا کر ہی لگا سکتا ہوں۔'' احمد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تو پھر چلو میرے ساتھ اور حساب لگا کر اس شاہی یاقوت کو تلاش کرو ورنہ سزا کے لیے تیار رہو۔'' سنار نے اسے دھمکی دی۔

اس کے بعد احمد نے اپنا علم نجوم کا سارا سامان سمیٹا اور سنار کے ساتھ اس کی سواری پر اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور پھر صحن میں ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر جھوٹ موٹ کچھ منتر پڑھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کاغذ اور قلم نکالا اور اس پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگا۔ اس دوران وہ کبھی کبھار نگاہ اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتا۔ گھر کے سارے ملازم، غلام اور کنیزیں بھی وہاں جمع ہو گئے تھے اور دیواروں کے ساتھ لگ کر ہاتھ باندھے با ادب کھڑے تھے۔ ان ہی میں کنیز اعلیٰ بھی شامل تھی۔ ایک بار احمد نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے ہی اشارہ کر کے احمد کو اطلاع دی کہ جو کام اس نے کہا تھا اس پر عمل کر دیا گیا ہے۔ یہ اشارہ پا کر احمد نے کاغذ پر لکیریں کھینچنا بند کر دیں اور اُٹھتے ہوئے سنار سے کہنے لگا۔

''ان سب لوگوں کو یہاں سے ہٹا دو اور میرے ساتھ اپنی خواب گاہ میں چلو۔''

سنار اس کو فوراً اپنی خواب گاہ میں لے گیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ احمد نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

''میں نے سورج اور چاند کی چال کا حساب لگایا ہے۔ ستاروں سے معلوم کیا ہے وہ سب یہی بتاتے ہیں کہ یاقوت اسی کمرے میں تمہارے بستر پر پڑے تکیے کے نیچے موجود ہے۔''

سنار نے سمجھا احمد پاگل ہو گیا ہے کیوں کہ وہ اس جگہ پہلے ہی یاقوت کو اچھی طرح تلاش کر چکا تھا مگر احمد کے کہنے پر اسے امید کی ایک کرن نظر آئی اس لیے وہ اپنے بستر کی طرف لپکا اور جب تکیہ اٹھایا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ گم شدہ یاقوت اسی تکیے کے نیچے پڑا تھا جہاں احمد نے نشان دہی کی تھی۔ خوشی سے بے قابو ہو کر اس نے احمد کو گلے لگا لیا۔ اسے سونے کی اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی دیتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اپنی اس کامیابی سے احمد کو کوئی خوشی نہیں ہوئی کیوں کہ وہ اپنی قابلیت جانتا تھا۔ وہ جان اور عزت بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے گھر واپس آ گیا۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی لالچی بیوی بے تابی سے اس کی طرف لپکی اور خوشی سے چلاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

(باقی آئندہ)

رانا محمد شاہد

منوڑا

ایک ساحلی اور تاریخی مقام

منوڑا...... پاکستان کا ایک اہم ساحلی جزیرہ ہے۔ کراچی میں واقع یہ ساحلی مقام اڑھائی کلومیٹر رقبہ پر محیط ہے۔ کیماڑی اور منوڑا دو چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ کیماڑی سے کشتی کے ذریعے 15 سے 20 منٹ میں منوڑا پہنچا جا سکتا ہے۔ منوڑا اور اس کے آس پاس اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں۔ جن میں بابا بھٹ، چرنا، بڈو بندال اور شمس پیر زیادہ مشہور ہیں۔

یہ ساحلی جزیرہ اپنی افادیت اور فوجی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیر و تفریح کے لیے بھی ایک اہم مقام ہے۔ چھٹی کے دن لوگوں کی ایک کثیر تعداد سیر و تفریح کے لیے اس جگہ کا رخ کرتی ہے۔ اس جزیرے کی طویل ساحلی پٹی پر اونٹ اور گھوڑے کی سواری سے مرد، خواتین اور بچے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ منوڑا کا جنوبی حصہ ہاکس بے اور دوسرے تفریحی علاقوں سے ملتا ہے۔ منوڑا ایک تاریخی پس منظر بھی رکھتا ہے۔

صدیوں پہلے یہ ایک ویران جزیرے کی مانند تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے سکندر اعظم نے قدم رکھے تھے اور اپنا ایک فوجی کیمپ بھی لگایا تھا۔ ایک برطانوی مورخ کے مطابق کراچی شہر اور منوڑا قدیم دیبل شہر کا حصہ تھے۔ اٹھارہویں صدی میں جب کراچی کے عرب ممالک سے تجارتی رابطے ہوئے تو بندرگاہ کے طور پر یہاں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہ قلعہ 1797ء میں کلہوڑہ حکمرانوں نے دفاعی نقطۂ نظر سے بنوایا تھا۔ جس پہ 1839ء میں انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ جزیرہ اب گزشتہ نصف صدی سے پاک بحریہ کے پاس ہے اور مرکزی بیس کے طور پر کام کر رہا ہے۔

منوڑا میں ایک قدیم تاریخی مسجد بھی ہے۔ یہ مسجد 1862ء میں کوکنی برادری نے تعمیر کرائی تھی۔ یہاں مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مسجد سے تھوڑے فاصلے پر بزرگ یوسف شاہ غازیؒ کا مزار ہے۔ یہاں بھی لوگوں کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ لوگ کشتیوں پر دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں۔ بابا یوسف شاہ کے بارے زائرین اور عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ بابا جی نے سبز لباس پہن کر 1965ء اور 1971ء کی پاک

بھارت جنگوں میں بھارتی حملوں کو ناکام بنا کر منوڑا اور کراچی کا تحفظ کیا تھا۔ بابا یوسف شاہ غازی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مشہور بزرگ عبداللہ شاہ غازیؒ کے بھائی تھے۔ جن کا مزار کلفٹن میں ہے۔

منوڑا میں سینٹ پال کا ایک چرچ (گرجا گھر) بھی ہے۔ یہ چرچ 1965ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ پاکستان کے بلند ترین لائٹ ہاؤس کے قریب واقع ہے۔ یہاں ہندوؤں کا ایک قدیم مندر بھی واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مندر کراچی کی قدیم ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ چوں کہ یہ برطانوی دورِ حکومت میں تعمیر ہوا۔ اس لیے ایک عام خیال ہے کہ یہ چرچ لائٹ ہاؤس تعمیر کرنے والے افسروں اور کاریگروں کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا۔ باہر سے چرچ سادہ ہے۔ تاہم اس کے اندرونی حصہ میں لکڑی کا انتہائی دیدہ زیب کام ہوا ہے۔

منوڑا جزیرے کا ایک اور اہم حصہ یہاں کا ''لائٹ ہاؤس'' ہے۔ اس لائٹ ہاؤس کا بھی تاریخی پس منظر ہے۔ اس لائٹ ہاؤس کو پاکستان کا بلند ترین لائٹ ہاؤس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی بلندی 91 فٹ ہے۔ اس لائٹ ہاؤس کا افتتاح کیم اپریل 1839ء کو کیا گیا۔ یہ لائٹ ہاؤس کراچی کی بندرگاہ کی طرف آنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس سے پھوٹنے والی روشنی 20 نائیکل سے دکھائی دیتی ہے۔ اس سے پہلے 1851ء میں اس جگہ ایک لائٹ ہاؤس بنایا گیا تھا لیکن اس کی بلندی بھی کم تھی اور اس سے پھوٹنے والی روشنی بھی تقریباً 10 نائیکل میل تھی۔ جب کراچی کا بیرونی دنیا سے تجارتی روابط میں اضافہ ہوا تو ایک زیادہ بلند اور بہتر روشنی والے لائٹ ہاؤس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ تقریباً 40 سال بعد اس لائٹ ہاؤس کو مزید بہتر اور مضبوط بنایا گیا۔ یہ آج بھی کراچی کی طرف آنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

1960ء میں یہاں پاک بحریہ کے افسروں کی تربیت کے لیے پاکستان نیول اکیڈمی قائم کی گئی اور بحریہ کے افسران کو جدید تقاضوں کے مطابق پیشہ وارانہ امور کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس نیول اکیڈمی کے تعلیمی اور پیشہ وارانہ معیار کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ پاک بحریہ کے افسران کے ساتھ ساتھ یہاں اتحادی ممالک کے تقریباً 2 ہزار افسران نے بھی تربیت حاصل کی۔ جو اب اپنے اپنے ممالک میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

منوڑا ایک پر فضا سیاحتی مقام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک رہائشی علاقہ بھی ہے۔ جیسے کراچی شہر میں ہر برادری اور علاقے کے لوگ آباد ہیں۔ ایسے ہی منوڑا میں بھی مہاجر، پنجابی، پٹھان، سرائیکی، میمن، بوہری، اسماعیلی اور عیسائی بھی رہتے ہیں۔ یہاں کی اچھی بات یہ ہے کہ مختلف مذہب، مختلف زبانوں اور نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود فرقہ وارانہ، نسلی یا لسانی کشیدگی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ لوگ ذہنی ہم آہنگی رکھتے ہیں اور برسوں سے پرسکون طریقے سے رہ رہے ہیں۔ منوڑا نہ صرف پاکستان نیوی کا ایک بڑا دفاعی مرکز ہے بلکہ عوام کے لیے بہترین ساحلی تفریح گاہ بھی ہے۔ یہاں جزیرے تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو سمندر کا کچھ حصہ جہازوں اور کشتیوں کے ذریعے عبور کرنا ہوتا ہے۔

منوڑا میں ہی ہندوؤں کا ایک قدیم ورون دیو مندر موجود ہے۔ یہ مندر اپنی خستہ حالی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ قدیم تاریخی ورثہ کے حامل اس مندر کی تزئین و آرائش کر کے سیاحت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

2006ء میں منوڑا کو سیاحتی مرکز بنانے کے حوالے سے ایک کوشش کی گئی۔ جب حکومت پاکستان نے دبئی اسلامی بینک اور دیگر اداروں سے ایک مفاہمتی یادداشت پر دستخط کیے۔ جس کے تحت منوڑا کو سیاحتی مرکز میں تبدیل کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں بلند و بالا ہوٹل اور دیگر تفریحی سہولتیں فراہم کی جانی تھیں۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کو ہربر برج تعمیر کرنا تھا۔ جس کی تعمیر سے کلفٹن اور ڈیفنس سے منوڑا کا فاصلہ کم ہو جاتا۔ اگر یہ برج تعمیر ہو جاتا تو یقیناً یہاں آنے والے افراد کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔

مختصراً یہ کہ منوڑا نہ صرف تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ ایک پرکشش سیاحتی مرکز بھی ہے۔ حکومت اور انتظامیہ اگر ان تاریخی مقامات مثلاً قدیم تاریخی مسجد، سب سے بڑا لائٹ ہاؤس، قدیم چرچ سینٹ پال اور قدیم مندر وغیرہ کی طرف توجہ دے تو نہ صرف روزگار کے مواقع ملیں گے بلکہ سیاحوں کے لیے کشش کا باعث بھی ہوگا۔

☆☆☆

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ایک گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ یہ کسان بہت جائیداد کا مالک تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ کسان نے سوچا کہ موت تو برحق ہے کیوں نا اپنی جائیداد اپنے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دوں۔ کسان چاہتا تھا کہ جائیداد کا حق دار وہ بیٹا ہو جو بہت عقل مند ہو اور محنتی ہو۔ اس نے سوچا کہ اپنے تینوں بیٹوں کی عقل کا امتحان لیا جائے اور جو اس کے سوال کا جواب دے، اسے جائیداد دے دوں۔ کسان نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا اور کچھ اشرفیاں دیں کہ اس سے ایسی چیز خرید کر لاؤ کہ اس سے تمہارا کمرہ بھر جائے۔ ایک بیٹا تنکے لے آیا لیکن کمرہ نہ بھرا، دوسرا بیٹا لکڑیاں لے آیا لیکن یہ بھی کمرہ نہ بھر سکیں۔ اب تیسرا بیٹا ایک ایسی چیز لایا کہ کمرہ پورا بھر گیا۔ کسان نے بیٹے کی عقل مندی پر جائیداد اسے دے دی۔

پیارے بچو! بتایئے تیسرے بیٹے نے ایسی کیا چیز خریدی کہ جس سے پورا کمرہ بھر گیا؟؟؟ سوچیے اور لکھ بھیجیے!
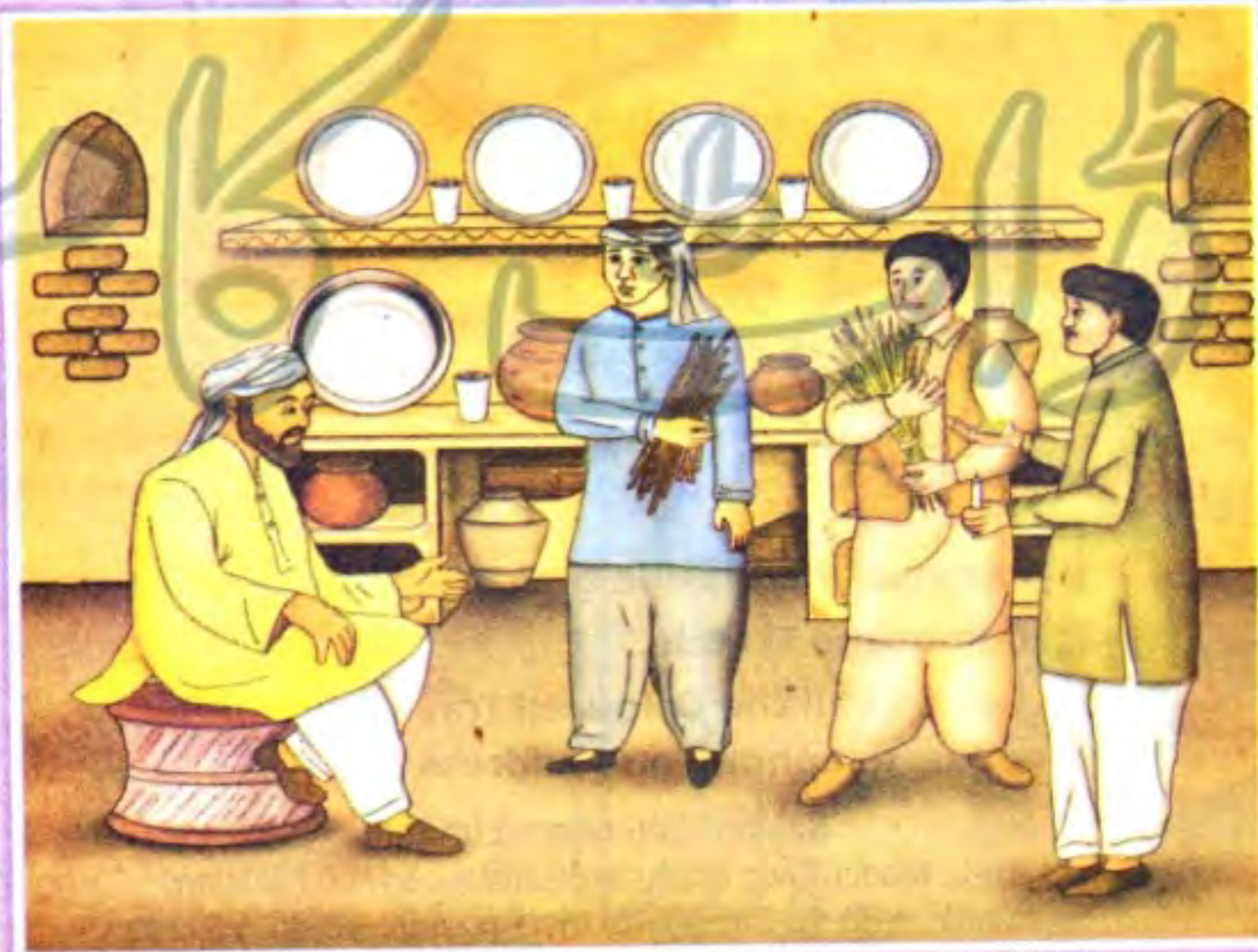
پیارے بچو! مارچ 2017ء کے کھوج لگایئے کا جواب ہے : جان آف آرک

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- ازکیٰ تحریم، میاں والی
2- گل فاطمہ، راول پنڈی
3- حافظہ لائبہ بنت الیاس، فیصل آباد
4- محمد احمد خان غوری، بہاول پور
5- عائشہ فاطمہ قادری، کاموکی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمائے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہونہار مصور

مینارِ پاکستان

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

نورالعین عینی، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

شیر علی طیب، شیخوپورہ (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

مسفرہ عبداللہ، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

ایمن اسلم، راول پنڈی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

میمونہ نوید، راول پنڈی (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: حافظ لائبہ بنت الیاس، فیصل آباد۔ فاطمہ یونس، لاہور۔ گل شان سردار، ساہیوال۔ محمد دانیال، لاہور۔ عاقب فرید گھلو، جھنگ۔ بادیہ عامر، سرگودھا۔ سلمان یوسف کمبوہ، علی پور۔ عیشہ فاطمہ، فیصل آباد۔ سید تیمور علی خالد، جھنگ صدر۔ احمد حسن، بہاول پور۔ ایمن فاطمہ، ملتان۔ محمد طلحہ بن ممتاز، راول پنڈی۔ ہانیہ آصف، لاہور۔ مریم طاہرہ، فیصل آباد۔ نائلہ حیدر، راول پنڈی۔ قاسم علی، کراچی۔ ثانیہ الیاس، کراچی۔ عبداللہ خان، اعتزاز احمد، لاہور۔ ساریہ نعمان، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ عذرا بی بی، ہزاری۔ سحرش گل خان، محمد علی خان، رمیصا طاہر، میاں والی۔ جویریہ طارق، راول پنڈی۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ علیاء وسیم، ڈیرہ غازی خان۔ محمد اسداللہ طارق، اسلام آباد۔ ہادیہ، ڈیرہ غازی خان۔ ابراہیم، اسلام آباد۔ احمد رضا، گجرات۔ یشفی عابد، تجلیٰ انجم، نوشہرہ درکاں۔

ہدایات: تصویر 9 انچ چوڑی، 6 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

اپریل کا موضوع
کھلونوں کی دکان
آخری تاریخ 8 اپریل

مئی کا موضوع
پھول اور تتلیاں
آخری تاریخ 8 مئی